DATE LABEL

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) ۱۵۴

علم الاقوام

(جلد اوّل)

تصنیف

ڈاکٹر بیرن عمر رالف ایہرن فیلس

ترجمہ از

ڈاکٹر سیّد عابد حسین صاحب

شائع کردہ

انجمن ترقیٔ اُردو (ہند) دہلی

۱۹۴۱ء

(کورونیشن پرنٹنگ ورکس دہلی)

فہرست مضامین

عنوان	صفحات

عنوان	صفحات

عام علم الاقوام اور ہندستان کا علم الاقوام
(غیر اہلِ فن کے لیے)

تعارُف

(از پادری ڈاکٹر وہلم کوپرس ایس۔ وی۔ ڈی)

لاطینی زبان کی مثل ہے کہ کتابوں کو بھی تقدیر کا نشیب و فراز دیکھنا پڑتا ہے۔ یہ مثل اس کتاب پر بھی صادق آتی ہے اور اس کے مصنف ڈاکٹر بیرن فان ایہر ینفیلس پر بھی۔

اپنے دل کی آواز کے تقاضے سے وہ بڑی تکلیفیں اٹھا کر ہندستان پہنچے اور یہاں بھی طرح طرح کی مشکلوں کا سامنا کر کے علم الاقوام کی تحقیقات کرتے رہے۔ مارچ ۱۹۳۹ء میں جب وہ ہندستان آئے اس وقت میں سنٹرل انڈیا کی ریاستِ جھبوا میں بھیلوں کے متعلق تحقیقات کر رہا تھا۔ وہ چند روز میرے پاس ٹھیرے اور مجھے اپنے پُرانے شاگرد سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ مہنجو دارو سے آئے

تھے اور حیدر آباد جا رہے تھے۔ انھوں نے مجھے اپنے آئندہ منصوبے اور پروگرام سے مطلع کیا۔

اکتوبر ۳۹ء کے شروع میں ہم دونوں کو ایک اور جگہ ملنے کا اتفاق ہوا یعنی احمد نگر میں غیر ملکی نظر بندوں کے کیمپ میں۔ وہاں بیرن ایہر ینفیلس نے مجھ سے ذکر کیا کہ وہ انجمن ترقیٔ اردو (ہند) کی فرمائش سے عام علم الاقوام اور ہندستان کے علم الاقوام پر ایک عام فہم کتاب لکھ رہے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں شائع کیا جائے گا۔ مصنف اور ناشر دونوں کی فرمائش تھی کہ میں اس کتاب کا دیباچہ لکھوں اور میں نے بہت خوشی سے اس کو منظور کیا۔ مگر اس وقت تو ہمیں سب سے زیادہ اس کی فکر تھی کہ دیکھیں ہمارا کیا حشر ہوتا ہے۔

حکومتِ ہند کی عنایت سے ہم دونوں کو اس کا موقع مل گیا کہ آزادی سے اپنی تحقیقات جاری رکھیں۔ مجھے تو وسطِ اکتوبر میں رہائی مل گئی اور میں ۳۹ء کے آخر میں یورپ چلا آیا، لیکن بیرن ایہر ینفیلس میرے آنے کے بعد رہا ہوئے اس لیے نہ ہم دونوں میں ملاقات ہو سکی اور نہ میں ان کی کتاب کا مسودہ دیکھ سکا۔ پھر بھی میں اپنا وعدہ پورا کرنے کے لیے یہ چند سطریں تعارف کے طور پر لکھ رہا ہوں، اس لیے کہ میں بیرن ایہر ینفیلس کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔ کئی سال تک میں اُن کا استاد رہ چکا ہوں اور ان خدمات سے بھی بخوبی واقف ہوں جو انھوں نے اس کے بعد علمی تحقیق کے میدان میں انجام دیں یہاں تک کہ انھوں نے علم الاقوام میں ماہرِ خصوصی کی حیثیت حاصل کر لی۔ میں نے ان کی بنیادی اور قابلِ قدر کتاب "ہندستان

میں وراثتِ مادری کے حقوق" کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہی اور مجھے یقین ہی کہ یہ کتاب بھی ان ہی خوبیوں کی حامل ہوگی۔

میں اپنے اور بیرنِ ایہرینفیلس کے ہندستانی دوستوں سے، ان حضرات سے جو علم الاقوام کے مسائل کی تحقیق، تاریخ تمدن کے طریقے کے مطابق کرنے کے مؤید ہیں اور ان سب حضرات سے جو علم و تحقیق کے میدان میں رہنمائی چاہتے ہیں، یہ درخواست کرتا ہوں کہ میرے دوست اور شاگرد کی اس کتاب کا ضرور مطالعہ کریں۔ مجھے یقین ہی کہ جو لوگ اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے ان کا دائرۂ نظر وسیع ہو جائے گا ان کی معلومات میں اضافہ ہوگا۔

میرے خیال میں زیادہ سے زیادہ کسی کتاب کی یہی تعریف ہو سکتی ہی اور اس سے اتنی ہی توقع کی جا سکتی ہی۔

فریبورگ (سوئٹزرلینڈ)

۲ر فروری سنہ ۱۹۴۰ء

دیباچہ

(از مصنف)

میں نے علم الاقوام پر تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے یہ کتاب، جو اُردو بلکہ ہندستان کی کل زبانوں میں اس موضوع پر سب سے پہلی کتاب ہے، بڑے شوق اور انہماک سے لکھی ہے۔ اس کی کئی وجوہ ہیں۔

ایک تو مجھے یہ احساس ہوا کہ ساری دنیا میں خصوصاً ہندستان میں عام لوگوں کے لیے علم الاقوام سے واقف ہونا ضروری ہے۔ جو ابتدائی اقوام دیہات اور جنگلوں میں اب تک موجود ہیں اور تیزی سے مٹتی جارہی ہیں ان کے متعلق ادب العوام، روایات اور تاریخ کا بے شمار مسالہ اس کا محتاج ہے کہ اس پر علمی تحقیق کی نظر ڈالی جائے۔ اگر ہندستان کے عام تعلیم یافتہ لوگوں کو اس کی اہمیت کا اندازہ ہو جائے تو وہ اسے محفوظ رکھنے کی کوشش کریں گے۔ میں اس مقصد میں کامیاب ہو جاؤں تو سمجھوں گا کہ میری محنت وصول ہوگئی۔ یہ کام جلد سے جلد کرنے کا ہے اس لیے کہ موٹر کی آمد و رفت اور تجارت کی روز افزوں ترقی سے "ابتدائی زندگی" کی دلچسپ اور خوشنما خصوصیات مٹتی چلی جارہی ہیں۔ میرے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی صلہ نہیں ہو سکتا کہ میری ناچیز کوشش سے ہندستان کے ذمہ دار لوگوں، معلموں، محکمہ تعلیم، جنگلات اور مال کے افسروں کو ان غریب جنگلی قبائل سے جن کے متعلق بہت غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے، دلچسپی

اور ہمدردی پیدا ہو جائے۔

دوسرے، ہماری موجودہ سیاسی زندگی میں یہ ایک نئی بات ہی جو پہلے کبھی نہ تھی کہ علم الاقوام اور علم الانسان کے دلائل سے بہت کام لیا جاتا ہی۔اکثر واقعات کو توڑ مروڑ کر انھیں حقیقت کے بجائے سیاسی مصلحتوں کا تابع بنا لیا جاتا ہی۔اس لیے علم الاقوام کے اصول کو آج کل عام معلومات کا لازمی جُز ہونا چاہیے۔اس سلسلے میں میں اپنے انگریزی داں ناظرین کو اپنے استاد ڈبلیو اشمٹ اور ڈبلیو کوپرس کی کتاب "طریقۂ تاریخ تمدن برائے مطالعہ علم الاقوام یا مسئلہ نسلیات کی علمی تحقیق" کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔اس کا دیباچہ ڈاکٹر کلائڈ کلک ہولم نے لکھا ہی اور یہ نیویارک سے شائع ہوئی ہی۔میری کتاب اس کے شائع ہونے سے پہلے تیار ہو چکی تھی اس لیے میں اس کے حوالے نہیں دے سکا بلکہ اب تک اس کا مطالعہ بھی نہیں کر سکا۔پھر بھی اس کے مصنفوں سے مجھے نجی طور پر معلوم ہوا ہی کہ اس میں اسی مسئلے کا، یعنی علم الاقوام کا مطالعہ تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے، کرنے کا ذکر ہی۔

تیسری، اور سب سے اہم وجہ یہ ہی کہ علم الاقوام کا تمدنِ اسلامی کی تاریخ اور اولین مذہب، اولین پیغمبر اور نوع انسانی کی وحدت کے اسلامی تصور سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہی۔اس لیے ظاہر ہی کہ جن لوگوں کو اسلامی تمدن اور اسلامی خیالات سے بلا واسطہ یا بالواسطہ تعلق ہی ان کے لیے علم الاقوام کا مطالعہ خاص طور پر دلچسپ ہی۔اس مسئلے کی تفصیلی بحث دیکھنی ہو تو رسالہ اسلامک کلچر حیدرآباد دکن بابت اکتوبر ۱۹۴۰ء میں میرا مضمون "علم الاقوام اور علوم اسلامی" ملاحظہ فرمائیے۔

میرا خوشگوار فرض ہی کہ تہِ دل سے ان سب حضرات کا شکریہ ادا کروں جن سے مجھے مشورہ اور مدد ملی۔

اس زمرے میں سب سے پہلے میرے استادوں کا نام آتا ہی جو وائنا یونیورسٹی کے ادارۂ علم الاقوام سے تعلق رکھتے تھے اور اب تمام دنیا میں منتشر ہو گئے ہیں۔ ان میں سے پروفیسر ڈاکٹر ڈبلیو۔ کوپرس نے مجھے علم الاقوام کی تحقیقات کا عام طریقہ سکھایا اور ڈاکٹر بیرن فان ہائنے گیلڈرن نے جو جنوب مشرقی ایشیا کے علم الاقوام میں خاص مہارت رکھتے تھے مجھے ہندستانی علم الاقوام کے مسائل سے آگاہ کیا۔ ڈاکٹر و۔ اشمٹ نے جو تاریخ تمدن کے طریق تحقیق کے بانی ہیں، مجھے یہ بتایا کہ مادری تہذیبیں تاریخِ عالم خصوصاً ہندستان اور مشرقِ قریب کی تاریخ کے لیے انتہائی اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن اس مسئلے کی طرف مجھے سب سے پہلے آسٹریا کی مرحومہ بیرنس اینٹو اینٹ ٹنٹی نے توجہ دلائی تھی۔ ان کی پُر زور تصانیف اور ان کی یادگار شخصیت زیادہ تر ان مسائل کے لیے وقف تھیں جو عورتوں کے حقوق سے تعلق رکھتے ہیں مگر اپنی بے وقت موت سے کچھ دن پہلے انھوں نے یہ اعتراف کیا تھا کہ علمی تحقیق کا مقصد ان کی زندگی کے اور سب مقاصد پر غالب آگیا ہی۔

یہی خیال میرے دل میں میرے شفیق باپ پروفیسر ڈاکٹر کرسٹیان بیرن ایہرن فیلس کی ذاتی مثال اور فلسفے اور سائنس کی اس تعلیم سے پیدا ہوا تھا جو انھوں نے میرے بچپن سے اپنے انتقال کے زمانے یعنی سنہ ۱۹۳۲ء تک مجھے دی تھی۔ وہ فلسفے کے پروفیسر بھی تھے اور عملی مصلح بھی۔ عام طور پر ان کی شاندار شخصیت سے اور خاص طور پر ان

کے نظریۂ کیف صورت سے نہ صرف میری ذہنی تعلیم پر بلکہ میرے علمی انداز خیال اور میری سیرت پر بہت گہرا اثر پڑا۔

اس کے علاوہ مجھے عضویات اور حسب کی اس تحقیقات سے بہت قابل قدر امداد ملی جو میری بیوی بیرنس فریڈل ایہرن فیلس اور کاؤنٹس اینٹا کوڈ نیہود کالرگس نے کی ہے۔

علم الاقوام کی تحقیقات کا جو کام میں نے ۱۹۳۸ء کی گرمیوں میں شروع کیا وہ سراسر میری بیوی کی بے غرضانہ مدد پر منحصر تھا۔ اسی طرح میرا ہندستان آنا ان کے ایثار کے بدولت ممکن ہوا۔ وہ سخت مصیبت کے زمانے میں میری جدائی برداشت کرنے پر تیار ہوگئیں خدا کرے ان تمام خطروں کے باوجود جو ہماری راہ میں حائل ہیں یہ جدائی محض عارضی ثابت ہو۔

میرے کام میں جن حضرات کی مہمان نوازی سے مدد ملی انھیں میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ ان میں ایتھنس کے وزیر نیکولو وارس، قاہرہ کے احمد بے الامروسی اور محمود درویش صاحب، کراچی کے ڈاکٹر داؤد پوتا ڈائرکٹر تعلیمات اور م۔ الف۔ زداوی صاحب اور لاڑ کانا کے محمد حنیف صدیقی صاحب شامل ہیں۔ صدیقی صاحب مجھے بارش میں بھیگی ہوئی سڑکوں سے مہنجو دارو لے گئے جو ان کے گھوڑوں کے لیے ایک مصیبت تھی۔

ریاست حیدر آباد میں مسٹر۔ ر۔م۔ گرانٹن اور مسٹر محمد علی حیدری نے مئی ۱۹۳۹ء میں فرح آباد کے چنچو قوم کے علاقے میں مجھے اپنا مہمان رکھا اور اسی طرح حیدر آباد کی ایک جنگی اور ابتدائی قوم سے ملنے کا موقع دیا جس کی تحقیقات کا مجھے عرصے سے شوق تھا۔

سرکارِ نظام کی فیاضی اور مہماں نوازی اور احمد نگر میں نظر بندوں کے کیمپ کے افسروں کی مہربانی سے مجھے اس کا موقع ملا کہ جنگ چھڑنے کے بعد بھی اس مسودے کی تکمیل کرسکوں۔

سب سے زیادہ میں مولوی ڈاکٹر عبدالحق صاحب اور سید ہاشمی صاحب کا شکرگزار ہوں جو اس کتاب کو شائع کر رہے ہیں۔ انھیں اس کام میں اول سے آخر تک انتہائی دلچسپی اور انہماک رہا اور انھوں نے میری وہ سب غیر متوقع درخواستیں پوری کیں جو مجھے ان غیر معمولی حالات کی وجہ سے کرنی پڑیں۔

مہمان خانہ سرکار عالی — عمرالف ایہرن فیلس

حیدرآباد (دکن) — ۱۸ر فروری ۱۹۴۰ء

مقدمہ

"انسانی علوم میں سب سے مفید خود انسانی زندگی کا علم ہے۔ مگر اسی نے سب سے کم ترقی کی ہے۔" یہ بات فرانس کے مایۂ ناز فلسفی روسو نے ۱۷۵۴ء میں کہی تھی۔ ایلیٹ اسمتھ نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے۔ "آج تقریباً دو سو سال کے بعد بھی یہ قول بالکل صحیح ہے .... انسانی تاریخ .... پر ایک مہذب معاشرے کے ہر رکن کے خیال اور عمل کی تشکیل، نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود، اور اس کے ہر فرد کی راحت و مسرت پر بڑا زبردست اثر ڈالتی ہے۔" [1]

علم الاقوام ساری انسانی تاریخ پر حاوی ہے۔ اس کی ایک شاخ جو آثارِ قدیمہ سے تعلق رکھتی ہے انسان کی قدیم ترین زندگی سے بحث کرتی ہے اور دوسری شاخ جو ادب العوام سے تعلق رکھتی ہے تہذیب انسانی کی جدید ترین نشو و نما کا مطالعہ کرتی ہے۔

اس کے علاوہ علم الاقوام اس کی توجیہ کی بھی کوشش کرتا ہے کہ انسانی معاشرے کی گوناگوں روایات جن میں سے اکثر بہت مضحک ہیں کیونکر وجود میں آئیں۔

یہ واقعہ نہایت تعجب خیز اور افسوسناک ہی مگر بالکل صحیح ہی کہ ہمارے زمانے کے اعلیٰ درجہ کے تعلیم یافتہ اور باخبر لوگوں میں سے بھی اکثر علم الاقوام سے بحیثیت ایک علم صحیح کے قریب قریب ناواقف ہیں۔ علم الاقوام کے موضوع یعنی نوع انسانی کے متعلق نہایت غیر علمی اور بے بنیاد روایات اب تک عام ہیں اور لوگ ان پر آنکھ بند کرکے ایمان لے آتے ہیں۔ اس بات کے کہ دنیا میں ایک "مردم خوری" کا دور گزرا ہی جب کہ "انسان انسان کو کھا جاتے تھے"۔ لوگ اسی طرح قائل ہیں جیسے اس عجیب و غریب نظریے کے کہ انسانوں کی مختلف قوموں کے شادی کے قوانین خارپشتوں اور کچھووں کی "فطری جبلتوں" سے مشابہ ہیں۔ اکثر علمی بحث میں علم الاقوام کے کسی ناقابل اعتبار ماخذ سے کوئی بے بنیاد مقولہ نقل کر دیا جاتا ہی، حالانکہ علم الاقوام نہ صرف بے لاگ علمی تحقیقات کا ایک صحیح اور معقول طریقہ دریافت کر چکا ہی بلکہ ان مسائل کے متعلق بہت کچھ مستند معلومات حاصل کر چکا ہی جن پر لوگ اب تک بے سروپا گفتگو کرتے ہیں۔

ان سب خرابیوں کی جڑ ناواقفیت ہی۔ اس کتاب کا، جس میں علم الاقوام کے خاص خاص مسائل اور اس کی تحقیقات کے اہم ترین نتائج بیان کیے گئے ہیں، یہ مقصد ہی کہ تعلیم یافتہ لوگ اس علم سے واقف ہو جائیں اور انسانی زندگی کے سب سے بڑے سوال یعنی انسانوں کے باہمی تعلقات کے مسئلے کا باقاعدہ علمی نظر سے اور دلچسپی کے ساتھ مطالعہ کریں۔

لفظ **Ethnology** جو اردو میں علم الاقوام کہلاتا ہی یونانی لفظ

Ethnos بمعنی "قوم" سے نکلا ہے، اور اس سے مراد انسانی معاشرت کا علم ہے۔ کبھی کبھی Anthropology یا علم الانسان کا لفظ بھی اسی معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ انسان کے متعلق ایک اور علم بھی ہے جو مختلف نسلوں کی جسمانی ساخت سے بحث کرتا ہے۔ اس علم کو آج کل عموماً "طبیعی علم الانسان" کہتے ہیں اور اس کا موضوع مختلف نسلوں کی جسمانی خصوصیات اور ان کے تغیرات کی تاریخ ہے۔

بخلاف اس کے علم الاقوام یا تمدنی علم الانسان "قوموں کی ذہنی اور روحانی زندگی کی تاریخ کے اس حصہ سے بحث کرتا ہے جس کی کوئی تحریری روئداد موجود نہ ہو۔ گویا علم الاقوام قوموں کی وہ تاریخ ہے جو تاریخ کے دائرے سے باہر ہو۔

اس علم کے اہم ترین مقصد کو واضح کرنے کے لیے ہم علم الاقوام کی تحقیقات کو تین بڑے بڑے حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔

(الف) عمرانیات۔ جس میں خاندان، قبائل اور قوموں کی تنظیم کی مختلف صورتوں، اُن کے رسم و رواج اور معاشرتی خصوصیات کا بیان ہوتا ہے۔ علم الاقوام کی یہ شاخ صرف ابتدائی قوموں کی معاشرت تک محدود نہیں ہے بلکہ بعد کی منزلوں سے بھی بحث کرتی ہے۔

(ب) مذہب کی تاریخ جس میں اس سے بحث کی جاتی ہے کہ مذہب کا آغاز کیونکر ہوا اور وہ قبل تاریخی زمانے میں قوموں کی زندگی میں کیا اہمیت رکھتا تھا؟ اور اب کیا اہمیت رکھتا ہے؟

(ج) تاریخ صنعت۔ جس میں مختلف انسانی جماعتوں خصوصاً ان

قوموں کی صنعت وحرفت اور فنون کی موجودہ اور گزشتہ حالت بیان کی جاتی ہے جو اب تک لکھنے پڑھنے سے محروم ہیں۔

مختصر یہ کہ علم الاقوام کا موضوع سب قوموں کی تہذیبی خصوصیات اور تمدنی کارنامے ہیں۔ اس منزل میں جس میں وہ اپنی تاریخ کو قلم بند نہ کر سکتی ہوں۔

لیکن علم الاقوام کا مقصد صرف ابتدائی یا قبل تاریخی معاشرے کے تہذیب وتمدن کا بیان اور اس کی تحلیل ہی نہیں بلکہ مختلف معاشرتی یا مذہبی رسوم، صنعت وحرفت، فنون لطیفہ غرض کل تہذیبی روایات کے آغاز کا پتہ چلانا اور اُن کی اہمیت اور غرض و غایت کو معلوم کرنا بھی اس میں داخل ہے۔

اس مقام پر تفصیل سے یہ بتانے کا موقع نہیں کہ قدیم روایات اور ان خیالات وتصورات کو انسانی زندگی میں کس قدر اہمیت حاصل ہے جو سانچے میں ڈھلے ڈھلائے ہم تک پہنچتے ہیں۔ صرف اتنا کہ دینا کافی ہے کہ ہمارے خیالات میں سے ننانوے فی صدی روایات اور قومی معتقدات وغیرہ سے متاثر ہوتے ہیں۔ اور صرف ایک فی صدی ہمارے اپنے ہوتے ہیں۔ اور یہ ضروری نہیں کہ یہ ایک فی صدی اُن ننانوے فی صدی سے بہتر ہوں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہم روزمرہ خرچ کرتے ہیں اس کا بہت بڑا حصہ ضروری اور کارآمد چیزوں پر نہیں بلکہ رسمی چیزوں پر صرف ہوتا ہے اور یہ بھی روایات کے تابع ہے۔ آرام اور صحت کی زندگی گزارنے کے لیے بہت تھوڑا سا سامان اور پوشاک کافی ہے بلکہ سچ پوچھیے تو جو کپڑے ہم محض رسم یا فیشن

کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جن پر ضرورت سے زیادہ صرف کرتے ہیں، اُن میں سے اکثر صرف بیکار ہی نہیں بلکہ ہماری صحت کے لیے مضر ہیں، اور ان کی وجہ سے ہمارے جسم میں گرمی اور سردی کی مزاحمت کی قوت کم ہو جاتی ہے۔

اسی طرح انسانوں میں باہم جو دشمنی نفرت اور رقابت پائی جاتی ہے اس کی توجہ کے لیے صرف تَنَازُعُ لِلْبَقَا یا دوسروں کی روٹی چھیننے کی خواہش کافی نہیں ہے۔ ان ادنےٰ انسانی جبلتوں کا ناگوار مظاہرہ اکثر ان روایات کا نتیجہ ہے جو ہمیں اپنی چیزوں پر فخر کرنا اور دوسروں کی چیزوں کو حقیر سمجھنا سکھاتی ہیں۔

یہاں ہم نے روایات کے منفی پہلو کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہیے کہ جو استحکام ہماری اجتماعی زندگی کو روایات کی بدولت حاصل ہوتا ہے اور جو سبق ان سے ملتا ہے اس کے بغیر تہذیب و تمدن کا کوئی کارنامہ اور کسی قسم کی ترقی صنعت و حرفت، فنون لطیفہ، معاشرت اور مذہب یا علم و حکمت میں ممکن نہیں۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ اکثر غیر معمولی قابلیت رکھنے والے ماں باپ کی اولاد بالکل نکمی ہوتی ہے اور اُسے اپنے والدین کے کارناموں سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ اگر روایات کا سلسلہ نہ ہوتا تو بہت سی نئی ایجادیں اور بڑے بڑے کارنامے ضائع ہو جاتے اور آئندہ نسلیں اُنھیں محفوظ نہ رکھ سکتیں۔ ہر شخص اپنی حالت پر غور کرکے یہ اندازہ کر سکتا ہے کہ اس کے علم اور تجربے، نیم شعوری اور قابلیتوں کا کتنا بڑا حصہ روایات کی بدولت حاصل ہُوا ہے اور اس کے علم و عمل

ہیں خود اس کی جدّتِ طبع کو کس قدر دخل ہے۔ وہ سب اوزار جن سے ہم روزمرہ کام لیتے ہیں مثلاً قلم، قینچی، چاقو یا ہل اب سے ہزار سال پہلے ایجاد ہوئے تھے۔ اسی طرح بائیسکل یا موٹر کار وغیرہ کی ایجاد محض ناممکن تھی اگر چھکڑے اور پہیے کی روایات موجود نہ ہوتیں، اور نوعِ انسانی کے دل میں مدتوں سے نقل وحمل میں آسانی پیدا کرنے کی خواہش نہ ہوتی۔

انسانی زندگی کے ذہنی اور روحانی دائرے میں تحفظ اور استحکام پیدا کرنے میں بھی روایات کی اہمیت کچھ کم نہیں ہے۔ ہمیں قبل تاریخی زمانے یا قدیم تاریخ چھاننے کی ضرورت نہیں خود ہمارے زمانے میں اُن انوکھے پیشواؤں اور جھوٹے رہنماؤں کی کمی نہیں جو نوعِ انسانی کو بہکا کر باہمی نفرت اور ہلاکت کا سبق پڑھاتے ہیں۔ اگر روایات ہماری تائید و نصرت نہ کرتیں تو نوعِ انسانی کے وہ بلند ترین تصورات، نورِ ایزدی کا وہ پرتو جس کی جھلک دنیا کے سب سے بڑے مذہبوں میں نظر آتی ہے غلط تاویلات سے مسخ کر کے شیطانی نفرت کی تاریکی میں تبدیل کر دیا جاتا۔

ان چند مثالوں سے روایات کی اہمیت دونوں حیثیتوں سے آپ پر واضح ہو گئی ہو گی۔ اس حیثیت سے بھی کہ وہ نوعِ انسانی کے لیے برکت اور تقویت کا باعث ہیں اور اس حیثیت سے بھی کہ ان کا بوجھ ہمیں ترقی کی راہ میں قدم بڑھانے سے روکتا ہے۔ اب آپ کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ علم الاقوام اُن سب لوگوں کے لیے کس قدر اہمیت رکھتا ہے جو نوعِ انسانی کے ماضی، حال اور مستقبل کے باہمی تعلق کو سمجھنا چاہتے ہیں اور دنیا کی تاریخ کا مطالعہ گہری نظر سے کرنا

چاہتے ہیں۔ اس لیے کہ اکثر بنیادی روایات، جن سے ہمارا احساس اور خیال، ہمارا قول اور عمل آج تک متاثر ہے، اس زمانے کی یادگار ہیں جبکہ ہمارے آباو اجداد "علم الاقوام کے موضوع" تھے۔ یعنی لکھنے پڑھنے سے محروم تھے۔

کسی کتاب کے مقدمے میں اس کے ذکر کا موقع نہیں ہے کہ جس علم سے وہ بحث کرتی ہے اس کا طریقِ تحقیق کیا ہے؟ تاہم اتنی بات کہہ دینا ضروری ہے کہ علم الاقوام کی تحقیقات نوع انسانی کی کل روایات اور تواریخ پر حاوی ہے۔ اس کی تفصیل آگے چل کر اس باب میں بیان ہوگی، جو علم الاقوام کے طریق تحقیق پر لکھا گیا ہے۔ لیکن اگر یہاں ان امور کی طرف ذرا سا اشارہ کر دیا جائے تو بے محل نہ ہوگا، اس لیے کہ طریقِ تحقیق کی مفصل بحث کرنے سے پہلے بعض اہم چیزوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

"بعض ابتدائی"، "نیم مذہب"، "وحشی یا پست ماندہ" اقوام میں جو کُل روئے زمین پر پھیلی ہوئی ہیں اُن تہذیبوں کے مختلف نمونے اب تک باقی ہیں جن پر "پوری مہذب" قوموں کا تہذیب و تمدن مبنی ہے۔ جب ہم ان تہذیبی روایات کی حقیقت، آغاز اور نشر کا پتہ چلاتے ہیں اور "ابتدائی" قوموں کی تاریخ میں ان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں نہ صرف خود ان روایات کی نشو و نما سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ خود ہمارے تہذیبی سرمائے کا کون سا حصہ کس قوم سے تعلق رکھتا ہے؟ مثلاً اگر ہم یہ دیکھیں کہ وہ قومیں جنھوں نے سب سے پہلے کاشتکاری شروع کی ایک دیوی کی پرستش کرتی تھیں جو زمین کی یا زرخیزی کی نمائندہ سمجھی جاتی ہے تو غالباً یہ نتیجہ

نکالنا بے جا نہ ہوگا کہ جن مہذب قوموں میں اس دیوی کی پرستش اب تک ہوتی ہے اُن کی تہذیب کا بہت بڑا حصہ ان ابتدائی زراعت پیشہ قوموں سے ماخوذ ہے۔ ("دین مسیحی" جو بحر روم کے ساحل سے شروع ہوا یا "شکتی پوجا" جو قبل آریائی زمانے میں مہنجو دارو اور ہڑپا میں شروع ہوئی، دونوں کا تعلق بحر روم کے ساحل کی تہذیبوں سے ہے) یا اگر ہم یہ دیکھیں کہ ابتدائی گلہ بانوں اور خانہ بدوشوں کی ہر قوم میں (مثلاً وسطِ ایشیا اور سائبیریا کے خانہ بدوش قبائل اور افریقہ کی بعض قومیں) یہ دستور ہے کہ عورتیں باپ یا شوہر یا بیٹے کی ملک سمجھی جاتی ہیں اور ان کی حیثیت ذمہ دار انسانوں کی نہیں بلکہ تجارتی مال کی ہے تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ جن مہذب قوموں میں اس قسم کے تصورات پائے جاتے ہوں اُن کے مورث خانہ بدوش گلہ بان تھے۔

قوموں کی روایات اور تاریخ کے باہمی علاقوں کی تحقیق صرف علم الاقوام کے مشاہدات یا تقابل ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس میں علم الاقوام کے "ہمسایہ علوم" یعنی آثارِ قدیمہ، لسانیات اور طبیعی علم الانسان سے بھی بہت کچھ مدد مل سکتی ہے۔

(الف) آثارِ قدیمہ۔ اس علم کی بدولت ہمیں قبل تاریخی قوموں کے اوزار، ظروف، طرزِ تعمیر اور فنونِ لطیفہ سے واقفیت ہوتی ہے۔ وادیٔ اِنڈس میں مہنجو دارو کے مقام پر آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے یہ پتہ چلتا ہے کہ ان شہروں کی صنعت، طرزِ تعمیر اور سنگ تراشی مشرق ادنےٰ کی صنعت وغیرہ سے نمایاں مشابہت رکھتی ہے۔ دوسری طرف علم الاقوام کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا ہے کہ مہنجو دارو کی تہذیب جنوب مغربی

ہندستان کی موجودہ تہذیب سے قریبی تعلق رکھتی ہے اور اس سے صریحی طور پر یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جنوبی ہند کی دراوڑی قوموں اور بحرروم کے ساحل پر رہنے والی قوموں میں باہم تاریخی علاقہ پایا جاتا ہے۔

(ب) طبیعی علم الانسان۔ اسی بات کی ایک اور مثال علم الانسان سے ملتی ہے۔ مہنجو دارو اور ہڑپا کی کھدائی میں جو کھوپریاں ملی ہیں وہ بھی اس کا پتہ دیتی ہیں کہ یہاں کے رہنے والوں اور جنوبی ہند اور ساحل بحر روم کے باشندوں میں باہمی تعلق ہے جس سے کہ مندرجہ بالا خیال کو اور تقویت پہنچتی ہے۔ طبیعی علم الانسان کی کارگزاری کی ایک اور مثال جو آثار قدیمہ سے تعلق نہیں رکھتی پھر بھی ہمیں علم الانسان کے نقطہ نظر سے انسانی تاریخ کے سمجھنے میں مدد دیتی ہے یہ دریافت ہے کہ سرخ امریکیوں اور امریکہ کے اصلی باشندوں، منگول قوموں اور مشرقی ایشیا کی نسلوں میں جسمانی ساخت کے اعتبار سے باہمی تعلق پایا جاتا ہے۔ اس سے قدرتی طور پر ہمارے اس خیال کو تقویت پہنچتی ہے جو خالص علم الاقوام کے مشاہدات کی بنا پر پہلے سے قائم کر لیا گیا تھا کہ سرخ امریکی کسی زمانے میں مشرقی ایشیا سے امریکہ میں آئے ہوں گے۔

(ج) لسانیات۔ جو انسانی زبانوں، اُن کی ابتدا اور نشو ونما اور اُن کے باہمی تعلقات سے بحث کرتی ہے۔ علم الاقوام کو مدد دینے والے علوم میں تیسرے نمبر پر ہے مگر اہمیت میں بقیہ دو سے کچھ کم نہیں ہے۔ یہ دریافت کہ غالباً ایک طرف سنسکرت اور قدیم ایرانی زبانیں اور دوسری طرف یورپی زبانیں سب کی سب آپس میں تعلق

رکھتی ہیں اس قدر مشہور ہی کہ اسے یہاں تفصیل سے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ہی۔ لیکن ہم اس مدد کی جو لسانیات سے علم الاقوام کو ملتی ہی ایک اور مثال ہندستان ہی سے پیش کرتے ہیں۔ ہماری مراد اس لسانیاتی تحقیقات سے ہی جو یہ معلوم کرنے کے لیے کی گئی کہ آریوں کے ہندستان میں آنے سے پہلے دراوڑی قوموں کی تہذیب کی کیا حالت تھی۔ ڈاکٹر سلیٹر تامل زبان کی تحلیل سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ یہ دراوڑی زبان جو آریوں کے آنے سے پہلے نشوو نما پاچکی تھی، "ایک مہتم بالشان تہذیب کی مدتوں کی کوشش کا نتیجہ ہی" اور "اس میں غیر معمولی دِقّتِ خیال اور منطقی رنگ پایا جاتا ہی"۔ [۲] ٹ۔ ر۔ سیشا آئینگر اسی موضوع پر بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ہند۔آریائی زبان " اور قدیم ترین ایرانی زبان کے فرق کی......... خاص علامت یہ ہی...... کہ اس میں حروف نَطعیّہ کا (جو دانت اور زبان کے ملنے سے ادا ہوتے ہیں) ایک اور سلسلہ موجود ہی........ یعنی حروف مُخّی (جن کے ادا کرنے میں زبان تالو سے لگتی ہی) یہاں حروف مُخّی کی اہمیت زبان کی تاریخ میں بڑھتی گئی اور اُن کی "سنسکرت کی لغت میں بہت کثرت ہوگئی" اگرچہ وہ "عموماً ہند۔یورپی زبانوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے اور صرف دراوڑی زبانوں کے ساتھ مخصوص ہیں"۔ [۳] ان دو مثالوں سے معلوم ہوتا ہی کہ زبان کی تحلیل اور تقابل سے کس طرح وہ نتائج اخذ کیے جاتے ہیں جو لسانیات کی حدود سے آگے بڑھ کر تاریخ تمدن کے دائرے میں داخل ہو جاتے ہیں۔

اگر لسانیاتی تحقیقات کے نتائج کی تائید علم الاقوام، آثار قدیمہ اور

علم الانسان کے مشاہدات سے بھی ہو رہی ہو۔ جیسے موجودہ صورت میں اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ دراوڑی قومیں اعلیٰ درجے کی ترقی یافتہ تہذیبی روایات رکھتی ہیں تو ہم ان نتائج کے قبول کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ علم الاقوام کی قابل وثوق تحقیقات حقیقت میں انسانی تہذیب کے ہر شعبے پر حاوی ہے اور اُن سب علوم کو جو انسانوں سے اور انسانی تاریخ سے تعلق رکھتے ہیں مدد دیتی ہے اور اُن سے مدد حاصل کرتی ہے۔

اس کتاب کا یہ مقصد نہیں کہ متنازع فیہ امور سے یا علم الاقوام کے جزوی مسائل سے بحث کی جائے۔ یہاں ہماری غرض صرف یہ ہے کہ جہاں تک ممکن ہے علم الاقوام کے مختلف مظاہر کی خوبیوں اور کوتاہیوں پر ایک وسیع اور ہمہ گیر نظر ڈالی جائے؛ اور علم الاقوام کی تحقیقات کے عام نتائج لوگوں کے سامنے پیش کر دیے جائیں تاکہ اُنھیں اپنے طور پر مشاہدہ اور غور و فکر کرنے کی تحریک ہو۔

یوں تو آج کل اس کی ضرورت عام طور پر محسوس کی جاتی ہے لیکن ہندستان جیسے ملک میں تو خاص طور پر محسوس ہونی چاہیے، جہاں روایات کو روزمرہ کی زندگی میں اور ملکوں سے بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے؛ اور اسی کے ساتھ مختلف تہذیبوں کا ایک ایسا مِلا جُلا نظام پایا جاتا ہے جس کی مثال دنیا میں اور کہیں نہیں ملتی ہے۔

عام لوگوں کو علم الاقوام کے مطالعہ سے اپنی حالت کے سمجھنے میں جو مدد مل سکتی ہے اس کے بدلنے میں وہ بھی علم الاقوام کی بہت

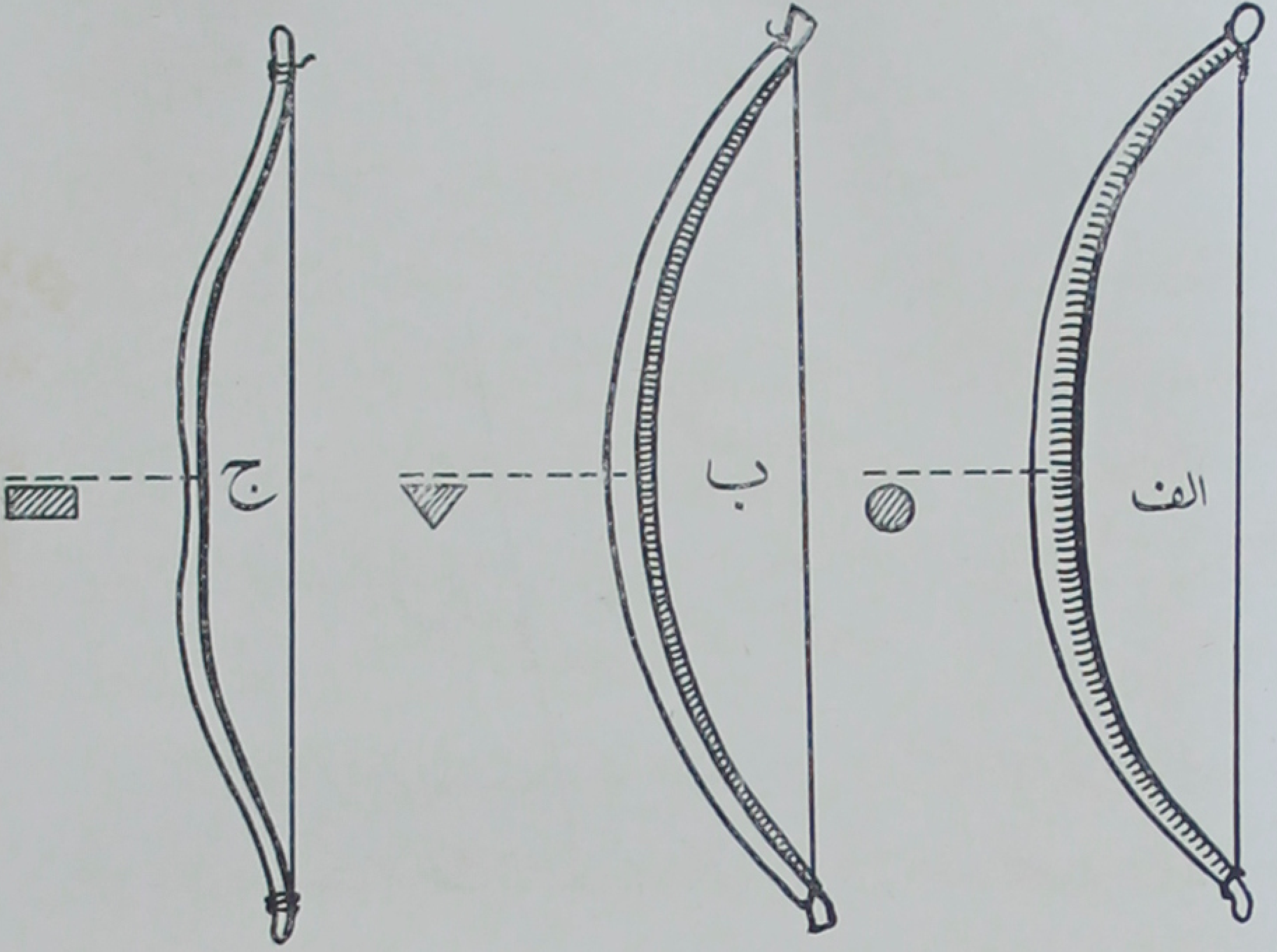
کچھ خدمت کر سکتے ہیں۔ اگر وہ مشاہدے سے کام لیں اور اس ملک کے مختلف حصوں کی روایات رسم و رواج، معتقدات اور اوزار وغیرہ کی تفصیلات کو بیان کریں تو بہت سے مسائل جو ہندستان کے علم الاقوام کی تاریخ میں ناقابل حل سمجھے جاتے ہیں، حل ہو جائیں۔

شاید اس بات کے سمجھانے کی ضرورت پڑے کہ اس مختصر کتاب کے شروع میں یعنی دوسرے باب میں ہم نے اس علم کی تعریف کیوں بیان کی ہے؟ کتاب کا آغاز خلاف معمول اس طرح کرنے میں ہم نے اس مصلحت کو سامنے رکھا ہے کہ علم الاقوام کے موضوع یعنی انسانی زندگی کے مطالعہ میں جو اختلاف رائے ہے اسے پڑھنے والے اچھی طرح سمجھیں اس کے علاوہ چونکہ یہ خیال ناواقف لوگوں میں بہت عام ہو گیا ہے کہ "ابتدائی" یا "وحشی" قومیں جانوروں اور انسانوں کے بیچ کی کڑیاں ہیں اور وہ ان کی تہذیب کو فرسودہ سمجھ کر حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں، اس لیے یہ ضروری تھا کہ خود ان حضرات کی تہذیب مشاہدہ کرنے سے پہلے علم الاقوام کی تاریخ بیان کر دی جائے تاکہ صحیح نقطۂ خیال قائم ہو جائے۔

جو لوگ یہ چاہتے ہیں کہ انھیں اس بات کا سرسری اندازہ ہو جائے کہ علم الاقوام کے خاص خاص اصول کیا ہیں اور وہ ہندستان کے حالات پر کس طرح عائد ہوتے ہیں اُن کے لیے یہ کافی ہوگا کہ وہ اُن بابوں پر جن کے عنوان "اہم ترین تہذیبی دائرے" اور "علم الاقوام کے بڑے بڑے حصے" ہیں ایک نظر ڈال لیں اور اس کے بعد دوسرے حصے کا مطالعہ کریں جو ہندستان کے علم الاقوام سے بحث کرتا ہے۔

اگر اس طرح سے تاریخ تمدن کے بارے میں اُن کے علمی ذوق کی کچھ تسکین ہو جائے تو غالباً ان کے لیے یہ مفید ہو گا کہ دوبارہ ساری کتاب کا مطالعہ اول سے آخر تک کریں۔

چونکہ اکثر دیکھا گیا ہو کہ اہل فن کی رائیں کثرت سے نقل کرنے کی وجہ سے ناواقف لوگ اُلجھن میں پڑ جاتے ہیں اس لیے ہم نے مختلف مسائل پر لکھنے والوں اور ان کی تصانیف کا حوالہ دے دینے پر اکتفا کی ہو اور ان کے اقوال بہت کم نقل کیے ہیں۔



(الف) اوّلین تہذیب کی سادہ شاخ نما کمان اور اُس کی گول آڑی تراش؛

(ب) میلانیسقی مغربی افریقی کمان اور اُس کی مثلث نما تراشش۔

یہ کمان مشرقی ملانیشیا اور مغربی افریقہ سے مخصوص ہی اور ان دونوں ملکوں کے درمیان جتنا علاقہ ہی اس میں کہیں کہیں پائی جاتی ہی اس سے اس نظریے کی تائید ہوتی ہی کہ دونوں ملکوں کی تہذیبیں ایک مشترک اصل سے نکلی ہیں۔

(ج) خم دار کمان اور اس کی مستطیل تراش۔ اس کی بعض مرکب شکلیں مختلف ٹوٹمی قبایل، خانہ بدوش گلہ بان اور بحر منجمد شمالی کے علاقے کے شکاری استعمال کرتے ہیں۔

پہلا باب

موضوع اور مقصد

علم الاقوام کا سب سے اہم مسئلہ یہ ہے کہ آیا انسانی تہذیب ایک مرکز سے دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی یا ہر جگہ علیحدہ علیحدہ وجود میں آئی۔

جو لوگ ہر تہذیب کے جداگانہ ظہور کے قائل ہیں اُن کا یہ خیال ہے کہ غیر متمدن قوموں یا "وحشیوں" میں عموماً رسم و رواج، صنعت و حرفت، فنون لطیفہ اور مذہب و اخلاق "ایک فطری قانون کی بنا پر" وجود میں آتے ہیں۔ یعنی اس "جبلی رجحان" کی وجہ سے جو بنی نوع انسان کو بعض ضوابط حیات یا فضائل اخلاق کی طرف ہوتا ہے۔

لیکن نظریۂ نشر کے ماننے والے یہ کہتے ہیں کہ تاریخ تحقیقات سے ثابت ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن کی جو خصوصیات ترقی یافتہ اور غیر ترقی یافتہ دونوں طرح کی قوموں میں پائی جاتی ہیں اُن میں سے اکثر ایک دوسرے سے ماخوذ ہیں ایسی مثالیں بہت شاذ ہیں کہ ایک ہی چیز دنیا کے مختلف حصوں میں علیحدہ علیحدہ وجود میں آئی ہو۔

جب کوئی غیر اہلِ فن اس مسئلہ پر بے لاگ غور کرتا ہی تو اُسے پہلا نظریہ یعنی ہر تہذیب کا جداگانہ ظہور زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہی۔ علم الاقوام کی تحقیقات کے ابتدائی دور میں اہل فن کا عام رجحان بھی یہی تھا کہ بالکل ایک سے یا قریب قریب یکساں تمدنی مظاہر کا دنیا کے مختلف حصوں میں وجود میں آنا ایک قدرتی چیز ہی اور اسے قاعدہ کلیہ سمجھنا چاہیے۔ جب لوگوں نے دیکھا کہ اُن جزائر میں جو آسٹریلیا کے شمال اور نیوگنی کے مشرق میں واقع ہیں ملانیشی نسل کے لوگ تیر کمان استعمال کرتے ہیں، غیر متمدن طرز کے مکان بناتے ہیں اور کشتی چلاتے ہیں تو انھوں نے یہ سمجھ لیا کہ ان کے طرز زندگی کا افریقیوں سے مشابہت رکھنا ایک قدرتی امر ہی کیونکہ یہ سب چیزیں جو ان کے یہاں پائی جاتی ہیں "قدرتی" چیزیں ہیں۔

لیکن جب آگے چل کر زیادہ تفصیلی مشاہدہ کیا گیا تو معلوم ہوا کہ کمان کی یہ شکل، اس پر تانت چڑھانے کی یہ خاص صورت، مکان بنانے کا یہ طریقہ، کشتی کے چپو میں انگریزی حرف T کی شکل کا دستہ لگانا صرف ملانیشیوں اور مغربی افریقہ کے بعض لوگوں میں پایا جاتا ہی حالانکہ ان دونوں خطّوں کے درمیان جو ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر ہیں، اور جتنے غیر متمدن قبیلے رہتے ہیں اُن کی کمانیں، مکان اور چپو بالکل دوسرے طرز کے بنے ہوتے ہیں۔ اس سے قدرتی طور پر یہ نتیجہ نکالا گیا کہ ان دونوں قوموں میں یعنی ملانیشیوں اور مغربی افریقہ کے باشندوں میں کچھ نہ کچھ تعلق رہا ہوگا، اور انھوں نے اس خاص طرز کے اوزار بنانا ایک دوسرے سے یا کسی تیسرے مشترک ماخذ سے

لیا ہوگا۔ اس خیال کو اس بات سے اور بھی تقویت پہنچتی ہے کہ ان اوزاروں کی یہ خصوصیات فنی ضرورتوں پر یا ان خام اشیا کی نوعیت پر جن سے یہ بنتی ہیں، مبنی نہیں معلوم ہوتیں۔

مزید برآں ان دونوں مقامات پر جو دو جداگانہ براعظموں میں ایک دوسرے سے بہت دور واقع ہیں ایک ہی قسم کی معاشرتی تنظیم پائی جاتی ہے۔ دونوں جگہ عورتوں کی حیثیت بلند ہے اور ترکہ لڑکیوں کو پہنچتا ہے۔ دونوں جگہ مردوں کے خاص قسم کے کلب ہوتے ہیں۔ جہاں وہ جمع ہوا کرتے ہیں۔ اس قسم کے رسم و رواج دوسرے ملکوں میں جو ملانیشیا اور مغربی افریقہ کے درمیان واقع ہیں عام طور پر نہیں پائے جاتے۔ ظاہر ہے کہ اس سے مندرجہ بالا خیال کی تائید ہوتی ہے کہ ان دونوں قوموں کی تہذیب ایک مشترک ماخذ رکھتی ہے یا اُس نے اپنی خصوصیات ایک دوسرے سے حاصل کی ہیں۔

اس طرح کی سینکڑوں ہزاروں مثالیں نظر آتی ہیں جن سے علمی مشاہدہ کرنے والوں پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دو مقامات کی تہذیب میں مطابقت یا مشابہت کا پایا جانا اکثر اس پر مبنی ہوتا ہے کہ تہذیب و تمدن یا ان کے مختلف عناصر ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ لفظ "اکثر" پر زور دینا ضروری ہے تاکہ ہم مبالغہ سے محفوظ رہیں۔ ظاہر ہے بعض مثالیں اس کی بھی موجود ہیں کہ مختلف مقامات پر یکساں حالات میں ایک ہی قسم کی ایجادات یا روایات بالکل جداگانہ طور پر وجود میں آئیں۔ خود اپنے زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیلیفون وغیرہ کی ایجاد یورپ اور امریکہ کے مختلف حصوں میں الگ الگ وقوع میں

آئی۔ اسی طرح عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہی کہ کسان جسے چین اور مغربی یورپ کے درمیان کے ملکوں مثلاً، ہندستان، ترکستان، ایران اور روس میں کوئی جانتا بھی نہ تھا حالانکہ وہ قرون وسطی میں اس قدر اہمیت رکھتی تھی۔ یورپ اور چین دونوں جگہ جداگانہ طور پر ایجاد ہوئی۔ لیکن ان دونوں صورتوں میں وہ نظری اور عملی شرائط جن پر یہ ایجادات موقوف تھیں اُن ملکوں میں جہاں یہ بنائی گئیں یکساں طور پر موجود تھیں۔ لہذا متمدن قوموں میں ایک ہی قسم کے آلات کے بنائے جانے کی یہ مثالیں جو کم و بیش یکساں حالات میں ظہور میں آئیں تہذیب انسانی کی جداگانہ اختراع یا اہل فن کی اصطلاح میں "مطابقت" کو ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں، بلکہ یہ سوال پیدا ہوتا ہی کہ تہذیب انسانی کے ابتدائی دور میں "مطابقت" یعنی تہذیب کے بنیادی مظاہر کی جداگانہ ایجاد کا تسلیم کرنا کہاں تک درست ہی؟

اگر اس سوال کا جواب یہ ہو، جیسا کہ حقیقت میں ہی، کہ انسانی معاشرت کے ابتدائی غیر متمدن طبقوں میں مطابقت کا ہونا بہت بعید از قیاس ہی تو پھر متعدد ضمنی سوالات پیدا ہوتے ہیں:۔

اگر تہذیب ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوئی تو یہ انتقال کب اور کیونکر واقع ہوا؟ تہذیب و تمدن کے مظاہر یعنی صنعت و حرفت علم و فن، معتقدات اور توہمات، اوزار اور آلات ایک قبیلے سے دوسرے قبیلے میں بہت سے مختلف طریقوں سے پہنچ سکتے ہیں۔ قبائل کا نقل مکان، تجارت، جنگ و جدل، عورتوں کو پکڑ لے جانا، غلاموں کی خرید و فروخت، تبلیغی جد و جہد، پجاریوں یا فقیروں کا ایک

جگہ سے دوسری جگہ پہنچنا، لوگوں کا اپنے دشمنوں یا قدرتی حادثوں کی وجہ سے اپنا ملک چھوڑ کر دوسرے ملکوں میں پناہ لینا، انسانوں کے باہمی تعلقات کی یہ اور اس قسم کی بہت سی صورتیں ہیں جنھیں ہم غیر متمدن قوموں میں اشیا، علوم اور روایات کے انتقال کا ذریعہ قرار دے سکتے ہیں۔

تاریخ تہذیب کا کام جو علم الاقوام کے نقطہ نظر سے لکھی جاتی ہے یہ بتانا ہے کہ تہذیبی اثرات انسانوں کی ایک جماعت سے دوسری جماعت پر کب اور کس طرح محرکات کے تحت میں پڑے۔

ظاہر ہے کہ تہذیب کے نشر اور انتقال کی مختلف صورتوں کا پتہ چلانے کی کوشش میں ہم بعض مشترک عناصر تک پہنچتے ہیں۔ جو نوع انسانی کی مختلف تہذیبوں میں پائے جاتے ہیں۔ یہی تہذیب کی ابتدائی یا اصلی شکل وہ مشترک مرکز ہے جس سے آگے چل کر سب تہذیبیں نکلیں۔

یہ محض ایک نظری مفروضہ ہے۔ یہ سوال کہ علمی تجربہ اور مشاہدہ کس حد تک اس مفروضے کی تائید کرتا ہے۔ ہماری آئندہ بحث کا موضوع ہوگا۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ کسی تہذیبی مظہر یا ادارے کا اصلی یا ابتدائی ہونا محض اس بات سے ثابت نہیں ہوتا کہ وہ ان چیزوں سے مختلف ہے جنھیں ہم اپنے نزدیک "ترقی یافتہ" سمجھتے ہیں محض کسی چیز کی سادگی بجائے خود اس کی شہادت نہیں دیتی کہ وہ "اصلی" یعنی نوع انسانی کی ابتدائی تہذیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس کے لیے ہمیں اس سے بہتر دلائل کی ضرورت ہے جن

کی تفصیل ہم یہاں نہیں بیان کر سکتے۔ اس لیے کہ اس باب میں ہمیں ابتدائی تہذیب کے معیار سے بحث نہیں کرنی ہی بلکہ علم الاقوام کے عام اہم مسائل سے۔

غرض اس علم کے اہم ترین مسائل کا خلاصہ حسب ذیل ہی:۔

(۱) تاریخ تمدن کے ہر شعبے کے مطالعے یا تحلیل کے بعد سب سے بڑا سوال یہ پیدا ہوتا ہی کہ آیا تہذیب انسانی کی مختلف شکلیں جداگانہ طور پر وجود میں آئی ہیں یا یہ سمجھنا چاہیے کہ ان کا ایک مشترک مرکز تھا اور وہاں سے وہ آگے چل کر مختلف ملکوں میں پھیلیں جو بعض صورتوں میں ایک دوسرے سے بہت فاصلے پر تھے۔

(۲) بہت غور و تحقیق کے بعد مختلف ملکوں کی تاریخ تمدن کا باہمی مقابلہ کرنے سے یہ ثابت ہوا کہ اکثر صورتوں میں ابتدا میں مرکز تہذیب کا مشترک ہونا اور آگے چل کر تہذیب کا ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہونا ایک مسلّمہ امر سمجھا جا سکتا ہی۔

(۳) یہ ضروری نہیں کہ انتقال تہذیب سے مراد قوم یا جماعت کا نقل مکان ہو۔ تہذیب یا اس کے مختلف عناصر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں۔ اس بات کا فیصلہ کرنا کہ ایک خاص تہذیب کس طریقے سے ایک ملک سے دوسرے ملک میں منتقل ہوئی علم الاقوام کی تحقیق کا ایک اہم جُز ہی۔

(۴) مختلف غیر متمدن قوموں کے تہذیبی عناصر کی تحلیل اور ان کی نشو و نما کا پتہ چلانے سے وہ علم الاقوام جو تاریخ تمدن کے مطالعے پر مبنی ہی، اس نتیجے پر پہنچا ہی کہ دنیا میں ایک ابتدائی

تہذیب تھی جسے ہم سب تہذیبوں کی مشترک بنیاد قرار دے سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ تہذیب و تمدن کے ارتقا کے وہ سب مدارج جو آگے چل کر طے ہوئے اسی نقطے سے شروع ہوئے تھے۔

اگرچہ اس باب میں جس کا موضوع یہ ہے کہ علم الاقوام کے اہم ترین مسائل اور مضامین کیا ہیں کسی مخصوص مسئلے سے بحث کرنے کا موقع نہیں ہے لیکن اتنی بات ہم ابھی سے کہہ سکتے ہیں کہ یہ ابتدائی تہذیب جس کا اوپر ذکر آیا ہے کوئی "وحشیانہ" زندگی نہیں تھی، بلکہ جو لوگ اس تہذیب کے حامل تھے ان کے بچے کھچے آثار صاف بتاتے ہیں کہ ان کے مذہبی تصورات سادہ اور واضح اور ان کا اخلاق بلند تھا اور وہ ایک دوسرے سے منصفانہ اور ہمدردانہ سلوک کرتے تھے۔ بہ خلاف اس کے ان کی مادّی املاک، صنعت و حرفت وغیرہ واقعی بالکل ابتدائی یعنی غیر ترقی یافتہ حالت میں تھی۔

دوسرا باب
علم الاقوام کی تاریخ

اس علم میں جو انسان اور اس کے کردار کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے قدرتی طور پر زاویۂ نظر اور طریق بحث کو اس سے زیادہ اہمیت حاصل ہے جتنی دوسرے علوم میں۔ علوم طبیعی۔ حیوانات۔ نباتیات۔ طبیعیات کیمیا بلکہ علم تاریخ۔ معاشیات۔ سیاسیات۔ اور جغرافیہ وغیرہ میں بھی زاویۂ نظر اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ مگر اس کا اثر واقعات کی تفسیر و تعبیر پر اتنا نہیں پڑتا جتنا علم الاقوام میں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں موضوع بحث انسان ہیں اور ان کے تغیر پذیر وضع و طریق۔ توہمات۔ تخیلات۔ دنیا اور آخرت کے عقائد قلم بند کئے جاتے ہیں، ان پر غور کیا جاتا ہے اور پھر ان کی تعبیر کی جاتی ہے۔ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں ایک ہی چیز مثلاً تعدد شوہراں کی رسم کی جو بعض قبائل میں رائج ہے، کتنی مختلف تعبیریں کی جاسکتی ہیں۔ تو ہم پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس علم میں ایک ہی مسئلے پر مختلف زاویۂ نظر سے بحث کرنے کی کس قدر گنجائش ہے۔

مسیحی مبلّغ ابتدا میں یہ سمجھتے تھے اور غالباً اب بھی یہی سمجھیں گے کہ ایک عورت کو ایک ہی وقت میں کئی مردوں سے شادی کی اجازت دینا اخلاقی پستی کی دلیل ہے اور انتہائی بہیمیت کی نشانی ہے۔

ایک مورّخ فطرت جو محض مادّی نقطۂ نظر رکھتا ہے اسی رسم کو ایک "قدرتی نظام" سمجھے گا جس کے لیے "ابتدائی تہذیب کی سند" موجود ہے اور اس کا یہ دعویٰ ہوگا کہ اخلاقی پستی کا کیا ذکر ہے یہ طریقہ تو فطری معاشرت کے عین مطابق ہے۔

زمانۂ حال کا ایک ماہر نفسیات جو نظریۂ کردار کا قائل ہو اس رسم کو "غیر طبعی" نفسی حالات۔ جنسی جذبے کو حد سے زیادہ اہمیت دینے عورتوں کے غیر معمولی تسلط کا نتیجہ قرار دے گا۔ اور اس کی یہ توجیہہ کرے گا کہ یہ بہت پیچیدہ اور مخصوص حالات کا نتیجہ ہے جو صرف شہروں کی تہذیب میں پائے جاتے ہیں۔

پرانے طرز کے عام مورخ جن کی دلچسپی جنگ و جدل تک محدود ہوتی ہے تعدد شوہراں کی رسم کی کچھ اور ہی توجیہہ کریں گے۔ شاید وہ یہ ثابت کریں کہ وہ لوگ جن میں تعدد شوہراں کا رواج ہوتا ہے عموماً حکمراں طبقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اکثر ان کا وقت میدانِ جنگ میں گزرتا ہے اس لئے بہت سے مردوں کو سالہا سال تک اپنے گھروں سے دور رہنا پڑتا ہے۔ ان مورخوں کے نزدیک صرف یہی وجہ ہے کہ ایک عورت کو ایک وقت میں کئی مردوں سے شادی کرنے کی اجازت دی گئی ہے۔

لیکن ان چاروں توجیہوں میں سے جن کا ہم نے یہاں اختصار سے ذکر کیا ہے، کوئی بھی اس کا حقیقی سبب نہیں بتاتی کہ تعدد شوہراں کی رسم کس طرح وجود میں آئی۔ اور اس بارے میں مطلق رہنمائی نہیں کرتی کہ ہم کیونکر، صرف ایک قوم کی نہیں بلکہ ساری دنیا کی مختلف تہذیبوں

کا مطالعہ اور اصلی واقعات کا مقابلہ کر کے حقیقی سبب معلوم کر سکتے ہیں اور ان نتائج پر پہنچ سکتے ہیں جو محض فرضی تاویلوں اور نظری قیاسات پر نہیں بلکہ واقعات اور مشاہدات پر مبنی ہیں۔

یہاں ہم یہ نہیں بتا سکتے کہ انسانی تہذیب کے آغاز اور منشا کی تاریخی تحقیقات کس طریقے سے کی جاتی ہیں لیکن اوپر جو مثال ایک ہی واقعہ کی مختلف تاویلات کی دی گئی ہے اس سے واضح ہو جائے گا کہ وہ نقطۂ نظر جس سے علم الاقوام اپنے موضوع بحث کو دیکھتا ہے کس قدر اہمیت رکھتا ہے۔ ان نقطہ ہائے نظر کے تنوع کو سمجھنے اور ہر ایک کی قدر و قیمت سے واقف ہونے کی بہترین صورت یہ ہے کہ ہم خود علم الاقوام کی تاریخ پر ایک نظر ڈالیں۔

جب کبھی بیانی جغرافیہ لکھا جاتا ہے یا علم الانسان کے سلسلے میں ابتدائی نسلوں کی جسمانی حیثیت سے بحث کی جاتی ہے تو اس میں خود بخود علم الاقوام کا کچھ حصہ بھی آجاتا ہے یعنی مختلف نسلوں کی جسمانی ساخت کی بحث اس لیے ہم علم الاقوام کی تاریخ کو صرف ان کوششوں کے مطالعہ تک محدود رکھیں گے جو در اصل ابتدائی قوموں کی تہذیب (معاشری تصورات، مذہب، آرٹ اور صنعت و حرفت) سے تعلق رکھتی ہیں۔

جب اہل چین اس علاقے میں پہنچے جو اب سلطنت چین کے جنوبی صوبوں پر مشتمل ہے اور انھیں وہاں میاؤ نسل کے لوگوں سے سابقہ پڑا تو انھوں نے پہلے پہل ابتدائی نسلوں کی تہذیب کے کم و بیش باقاعدہ مطالعہ کی بنیاد ڈالی۔ قدیم چینی قاموسوں میں

ان کے اوزاروں اور آلات کی تفصیلیں موجود ہیں جو آج تک جنوب مشرقی ایشیا کے مادّی تمدن کی علمی تحلیل میں بہت کار آمد ہیں۔ لیکن جن قبائل کا ذکر کیا گیا ہے ان کے نظام معاشرت اور مذہب کے متعلق بہت کم معلومات حاصل ہیں۔ ان محققین کا نقطۂ نظر زیادہ تر عملی تھا۔ ان میں نہ یہ صلاحیت تھی اور نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ خود ان قبائل کے نقطۂ نظر سے اس زمانے کے واقعات کا مطالعہ کریں لہذا اُن کا بیان کوئی علمی حیثیت نہیں بلکہ محض عملی قدر رکھتا ہے۔

ممکن ہے کہ وسط افریقہ کے پستہ قد قبائل کی ابتدائی تحقیقات پر جو قدیم مصری تصویروں میں نقش کی گئی ہے، یہی بات صادق آتی ہو لیکن بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان مصوّروں کے دل میں طلبِ حق کا علمی ذوق نہیں تو کم سے کم تجسّس کا مادّہ ضرور تھا اور یہی مادّہ اُن بادشاہوں میں بھی نظر آتا تھا جو تصویروں میں ان دونوں کے ساتھ دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے دکھائے گئے ہیں، جن کی اولاد اب تک وسط افریقہ کے قدیم جنگل میں لمبے اور سڈول جسم والے بانتو حبشیوں کے درمیان پائی جاتی ہے جنھیں یقیناً ان سے کوئی نسلی رشتہ نہیں۔ ان کی تہذیب کی تاریخ آگے چل کر ہماری دلچسپی کا خاص موضوع رہے گی۔ اس لیے کہ یہ لوگ سب سے قدیم یا اصلی انسانی تہذیب کی بچی کھچی نشانیاں ہیں۔

علم الاقوام کی ابتدائی کوششوں کی تیسری مثال نیوبیا کے حبشیوں اور دوسرے افریقی قبائل کا وہ ذکر ہے جو ارسطو نے کیا ہے وہ ان حبشیوں کی خوبصورتی، طاقت اور ذہانت کی تعریف کرتا ہے۔

جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں عالمانہ انصاف کا اور بے تعصبی سے دوسری قوموں کی خوبیوں کی قدر کرنے کا مادہ موجود ہے۔ یہ صفت جو علم الاقوام اور علم الانسان کے ماہروں کے لئے ناگزیر ہے بدقسمتی سے ارسطو کے بعد آنے والوں میں بہت کم پائی جاتی ہے۔

قرون وسطیٰ کی فتوحات اور سیاحتوں کے طویل سلسلے پر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو فاتح یا سیّاح لکھنا پڑھنا جانتے تھے انھوں نے بھی ابتدائی قبائل یا وحشیوں کی زندگی کا کوئی ایسا بیان نہیں چھوڑا ہے۔ جو ذرا بھی علمی حیثیت رکھتا ہو۔ غالباً کچھ تو تبلیغی جوش نے اور کچھ غیر قوموں کو مغلوب کر کے اپنے رنگ میں رنگ لینے کی خواہش نے ان فاتحوں کی آنکھوں پر پردہ ڈال دیا۔ اور وہ ان چیزوں کو علمی بے تعصبی کی نظر سے نہ دیکھ سکے۔ لیکن افسوس تو یہ ہے کہ ارسطو کے بعد سے اٹھارھویں صدی عیسوی تک کے طویل زمانے میں یورپ اور ایشیا کے فاتحوں نے غیر متمدن قوموں کے بارے میں کوئی غیر علمی اور تعصب آمیز بیان بھی نہیں چھوڑا۔ جس سے ہمیں کچھ تھوڑی بہت معلومات حاصل ہو سکتیں۔ مثلاً راماین میں اسوروں اور راکشسوں کے متعلق جو کچھ لکھا گیا ہے اگرچہ ہم اسے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ اُن قوموں کی تہذیب کا علمی مطالعہ کرنے کی ابتدائی کوشش یا پہلا قدم ہے جو آریوں سے پہلے ہندوستان میں رہتی تھیں تاہم ان مخالفانہ بیانات سے بھی ہم ان "دیوزادوں" یا "بَن مانسوں" کے معیار تہذیب کے متعلق کچھ نہ کچھ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں۔

کم سے کم ان کے متعلق یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ وہ زر و دولت اور علم و فن

سے مالا مال تھے۔

یہ بیان صحت سے خالی اور تعصب سے پُر سہی مگر کچھ ہے تو۔ قدیم یورپی سیّاحوں اور مبلغوں خصوصاً ہسپانویوں۔ پُرتگالیوں اور اطالویوں نے تو اقوام عالم کے متعلق اپنے ان دلچسپ تجربوں کا کوئی ذکر ہی نہیں کیا جو انھیں دنیا کے گرد پہلی بار جہاز رانی کرنے میں حاصل ہوئے ہوں گے۔

ان "ابتدائی قوموں" کے متعلق جو لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں پہلا علمی بیان اور تقابلی مطالعہ فرانسیسی یسوعی پادری لافیتو کا ہے جس نے شمال مشرقی امریکیوں اور سرخ ہندیوں کو عیسائی بنانے کی کوشش کی۔ ۱۷۲۴ء میں اس نے ایک کتاب لکھی جس میں یہ دکھایا کہ امریکہ کے اصلی باشندوں اور قدیم رومیوں۔ یونانیوں اور عبرانیوں میں کن کن باتوں میں مشابہت اور کن کن باتوں میں فرق ہے۔ اس کے بعد اس نے ایک نہایت دلچسپ رسالہ ایروکی اور ہرونی قبائل کے معاشرتی نظام پر لکھا جو اسی شمال مشرقی امریکہ میں بستے تھے۔ یہ اس معاشرت کا جسے ہم حکومت مادری کا نظام کہتے ہیں سب سے پہلا علمی بیان تھا۔ لافیتو نے لکھا ہے کہ یہاں عورتوں کو خاندان اور ریاست کے معاملات میں بہت کچھ دخل تھا۔ ترکہ لڑکیوں کو ملتا تھا۔ اور رشتہ ماں کی طرف سے شمار ہوتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ "طبعی" معاشرتی زندگی سے ایک انوکھا انحراف تھا۔ اسے یہ خبر نہیں تھی کہ اور بہت سے معاشروں میں بھی یہی دستور رائج ہے۔ مگر اس کے ان دلچسپ ملاحظات کی

طرف ڈیڑھ سو سال تک لوگوں نے کوئی توجہ نہیں کی۔ اس کے بعد
اُن مسیحی مبلغوں، سیاحوں، سپاہیوں اور تاجروں کو جو یورپ سے دنیا
کے ہر حصے میں جایا کرتے تھے "قدیم نسلوں" سے ایک نیم علمی دلچسپی
یا کم سے کم ان کے حالات بیان کرنے کا شوق پیدا ہونے لگا۔ یہ
بات قابل لحاظ ہے کہ یورپ کی اُن تمام قوموں میں جو بحری سفر کرتی
تھیں اور نو آبادیاں قائم کیا کرتی تھیں، نہ تو ہسپانویوں پرتگالیوں اور
اطالویوں کو اور نہ ہالستانیوں اور انگریزوں کو بلکہ صرف فرانسیسیوں
کو "وحشی" قوموں سے علمی دلچسپی اور انسانی ہمدردی تھی اس لیے کہ
فرانسیسیوں کا ذہن ہمیشہ سے نوع انسانی کو بغیر رنگ اور نسل کی
تفریق کے وسیع اور ہمہ گیر نظر سے دیکھتا رہا ہے۔ اٹھارھویں صدی
کے آخر میں ایک اور فرانسیسی گوگے نامی نے اس مسئلہ پر پہلا
باقاعدہ مقالہ لکھا کہ انسانی ارتقا کا کیا اصول ہے اور "پوری متمدن"
قومیں اُن "وحشیوں" سے کیا تعلق رکھتی ہیں جو لکھنے پڑھنے سے
محروم تھیں۔ اس نے اس نظریے کی داغ بیل ڈالی جسے ہم اب
"ارتقائیت" کہتے ہیں، اگرچہ خود اس نے اس لفظ کو استعمال نہیں
کیا ہے۔ اس کے خیالات کا لب لباب یہ ہے کہ انسان ابتدا میں بالکل
وحشی اور تہذیب و تمدن سے کورے تھے۔ مگر رفتہ رفتہ تعلیم یافتہ
اور مہذب بن گئے، جیسا کہ خود فاضل مصنف اور اس کے
گرد و پیش کے لوگ تھے۔ ان خیالات سے انتہا پسند ارتقائیوں
میں جو بڑے بڑے نقائص ہیں وہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ لیکن سب
سے بڑے نقص پر علم الاقوام کے ماہروں کی آئندہ تین نسلوں میں کسی

کی نظر نہیں پڑی۔ اور یہ ابھی، بیسویں صدی کے شروع کی بات ہے کہ علم الاقوام کے مباحث کو اس سے پاک کرنے کی کوشش کی جارہی ہو گی۔

ایک اور فرانسیسی مصنّف دوبروس نے بھی جو اٹھارھویں صدی کے آخر میں گزرا ہے قدیم مذاہب کے متعلق یہ غیر علمی خیال ظاہر کیا کہ وہ سب "ابتدائی" مذاہب ہیں اور یہ نظریہ قائم کیا کہ بنی نوع انسان شروع میں بے جان چیزوں، پودوں اور جانوروں وغیرہ کی پرستش کرتے تھے، اس لیے کہ اُن کے عقیدے میں ہر چیز لازمی طور پر روح رکھتی ہے، اگرچہ بعض چیزوں میں بظاہر روح معلوم نہیں ہوتی لیکن حقیقت میں پوشیدہ ہونے کی وجہ سے ان کی روح اور بھی زیادہ قوت اور قدرت رکھتی ہے۔ یہ نظریہ ہر خود پسند متمدن انسان کو جو "وحشیوں" کی زندگی کا مشاہدہ کرتا ہے پسند آتا ہے۔ لیکن آگے چل کر یہ ثابت ہوا کہ یہ نظریہ واقعات سے مطابقت نہیں رکھتا اور بجائے اس کے کہ اس سے "ابتدائی مذاہب" کے اندرونی محرکات کو سمجھنے میں مدد ملتی اس نے ہمیں علمی نقطۂ نظر سے دور کر دیا۔ ہم آگے چل کر یہ بتائیں گے کہ کس طرح "قبل منطقی" زندگی کے تصور کی شکل میں علم الاقوام کے ماہروں، خصوصاً فرانسیسیوں کے یہاں باوجود اختلاف خیال کے بنیادی غلطی چلی آتی ہے کہ وہ ابتدائی یا غیر متمدن اور ترقی یافتہ یا متمدن انسانوں کی نفسیات کو ایک دوسرے سے بالکل مختلف سمجھتے ہیں۔ بہر حال باوجود اس کے کہ دوبروس نے غلط رائے اختیار کی لیکن اس کی یہ فضیلت ماننی پڑے گی کہ اُس نے سب سے پہلے وحشی

اقوام کے مذہب اور عقائد کی علمی تحلیل کی اور غیر ملکی تہذیبوں اور اُن کے کارناموں کے مطالعہ کا شوق پیدا کیا۔

"مطالعۂ اقوام" یعنی غیر قوموں کے حالات کے مطالعہ کی اصطلاح فرانس میں ۱۷۹۲ء میں وضع کی گئی۔ اور اس کے کچھ عرصہ بعد "علم الاقوام" کی اصطلاح بھی وہیں وضع ہوئی۔ جس سے مراد وہ باقاعدہ علم ہے جو غیر اقوام کے متعلق ہر قسم کی معلومات کی تحلیل اور تعبیر کرتا ہے اور اس کے نتائج کو ترتیب دیتا ہے۔

۱۸۰۰ء کے تھوڑے عرصہ بعد لسانیات کے تقابلی مطالعہ نے بہت ترقی کی۔ مشرقی زبانوں خصوصاً سنسکرت کی کتابوں کے جیّد ترجمے بھی اسی زمانے میں پہلے پہل انگلستان میں کئے گئے۔ اور رھائن کے علاقے سوسٹان، آسٹریا۔ پروشیا اور وسط جرمنی کی ریاستوں میں رومانی مذاق کے لوگوں نے خود اپنے ملک اور غیر ملکوں کے ادب العلوم اور عام پسند داستانوں اور کہانیوں کا مطالعہ شروع کیا اور اسی کے ساتھ یہ کوشش کی گئی کہ قومیت کو لسانی، روایاتی اور نسلی اتحاد پر مبنی ثابت کیا جائے۔ مگر تھوڑے ہی دن بعد یہ معلوم ہوگیا کہ اس اتحاد کا "تصوّر" بالکل غیر علمی ہے۔ اور واقعات سے مطابقت نہیں رکھتا۔ مثلاً سوئستانی قوم زبان کے اعتبار سے تین جماعتوں میں منقسم ہے۔ جن میں سے ایک فرانسیسی، دوسری جرمن اور تیسری اطالوی بولتی ہے۔ نسلی حیثیت سے یہ سب لوگ قریب قریب ایک ہیں اور اسی آبائی نسل سے ہیں جو ہمسایہ فرانسیسی اور آسٹروی پہاڑی علاقوں میں بستی ہے۔ لیکن وہ اپنے آپ کو ایک منفرد قوم

سمجھتی ہے، اپنی خاص روایات اور شعور خودی رکھتی ہے جسے ہمسایہ قوموں سے کچھ تعلق نہیں۔ اس قسم کی مثالیں قریب قریب ہر جگہ پائی جاتی ہیں۔ ایسا تو شاذ ہی ہوتا ہے کہ زبان، نسل اور قومی شعور کی حدود ایک ہوں چہ جائیکہ مذہب بھی ایک ہو۔

جب علم الاقوام کے صحیح اصول سے اس انحراف کا علم لوگوں کو ہوا اس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد جدید سائنس داں چارلس ڈاردن کا ظہور ہوا اور تاریخ طبیعی یعنی نباتیات، حیوانیات اور انسان کے جسمانی پہلو کے متعلق اس کی تحقیقات اور مشاہدات نے شہرت حاصل کی۔ اس کی اس تحقیق نے کہ سطح ارض کے کل جاندار ایک ہی سلسلۂ ارتقا میں مربوط ہیں سائنس کے نقطۂ نظر میں ایک انقلاب پیدا کر دیا۔ ظاہر ہے کہ علم الاقوام بھی اس سے غیر متاثر نہیں رہ سکتا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں پیرس میں اور اس کے تھوڑے عرصہ بعد لندن میں علم الاقوام کی ایک انجمن کی بنیاد پڑی تھی۔ لیکن ۱۸۵۹ء سے ایک عرصہ تک علم الاقوام محض علم الانسان کی ایک شاخ بن کر رہ گیا۔ یعنی وہ علم جو افراد اور اقوام کا مطالعہ صرف جسمانی پہلو سے کرتا ہے۔ یہ تاریخ طبیعی سے اس روز افزوں دلچسپی کا نتیجہ تھا جو ڈاردن کی تحقیقات کی بدولت پیدا ہو گئی تھی۔

۱۸۵۹ء کئی لحاظ سے خاص امتیاز رکھتا ہے۔ اسی سال ڈاردن کا نظریہ شائع ہوا۔ پیرس میں "انجمن علم الانسان قائم ہوئی۔ قدیم حجری عہد کے پتھر کے اوزار پہلے پہل شمالی فرانس کی وادی سوم میں پائے گئے۔ جو بہت ہی قدیم انسانوں کے ابتدائی اوزار تسلیم

کیے گئے ہیں۔ اسی سال دو کتابیں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں جنھوں نے اس خیال کی تائید کی کہ تاریخ طبیعی کی تحقیقات کے مطابق انسانی تاریخ کا مطالعہ بھی ارتقائے طبیعی کے نقطۂ نظر سے کرنا چاہیے۔ ان میں ایک بیٹین کی کتاب "انسان، تاریخ میں" تھی اور دوسری ویتس کی "فطری اقوام کی انسانیات"۔ یہ دونوں جرمن زبان میں تھیں اور دونوں اس خیال پر مبنی تھیں کہ انسان کی نفسی، ذہنی اور روحانی نشوونما بھی قدم بقدم ارتقا کی اُنھیں منزلوں سے گزری ہوگی جن سے اُس کی طبیعی یعنی جسمانی زندگی گزری ہے۔ ابتدائی انسان ان لوگوں کے نزدیک جانور تھے۔ وہ محض غیر متمدن ہی نہیں بلکہ وحشی تھے جو اعلیٰ اخلاقی صفات سے خالی اور آرٹ، حسن اور مذہب کے بلند تصورات سے کورے تھے۔ یہ تصور جیساکہ واقعات کی دلیلوں سے آگے چل کر ثابت ہوا، غلط اور گمراہ کن تھا۔ اس کا ایک خراب اثر سائنس پر یہ بھی پڑا کہ وہ چیز جو غیر قوموں کی معاشرت، مذہب یا عمل میں اس رسم و آئین سے مختلف نظر آئی جو خود مشاہدہ کرنے والے کی قوم میں رائج تھی اُسے وہ غیر شعوری طور پر "ابتدائی" یا اس مخلوق کی یادگار سمجھ لیتا تھا جو حیوان اور انسان کے درمیان گزری ہے۔ تمدنی خصوصیات کی تفسیر محض ارتقائی نقطۂ نظر سے کرنا اس نظریے کا غلط استعمال تھا جو خود اپنے میدان میں یعنی جسم انسانی کی تاریخ کے مطالعہ میں حقیقت سے بہت قریب تھا۔

سوئیتان کے نظری علم الاقوام کے ماہر جان جیکب باخوفن نے جو تحقیقات کی تھی وہ جزوی معلومات کے لحاظ سے تو نہیں

مگر نتائج کے لحاظ سے بہت ناقص تھی اور اگر اس میں واقعات کی غلط تعبیر نہ ہوتی تو وہ علمی تحقیق کا نہایت اہم کارنامہ سمجھی جاتی۔ اس نے تفصیل کے ساتھ یہ ثابت کیا کہ حکومت مادری پر مبنی معاشرت جس کا ذکر لافیتو نے کیا ہے اس کے کچھ آثار کلاسیکل عہد میں قدیم یونان اور اس کے ہمسایہ ملکوں میں بھی پائے جاتے تھے۔ اس کی مشہور کتاب "حقوق مادری" جو انیسویں صدی کے آخر میں شائع ہوئی حقیقت میں علم الاقوام کی تحقیق کا ایک نیا دور شروع کرتی ہے اس لیے کہ اس نے ایک ایسے مسئلہ پر جس کے لحاظ سے انسانی تہذیب اور معاشرت میں بہت اہم اور نمایاں اختلافات پائے جاتے ہیں یعنی عورتوں کی حیثیت پر کما حقہ روشنی ڈالی۔ باخوفن نے قطعی دلائل سے یہ ثابت کر دیا کہ اس زمانے سے فوراً پہلے جسے ہم یونان اور مشرقی بحر روم کے کنارے کے ملکوں کا کلاسیکل دور کہتے ہیں یقیناً ایک ایسی معاشرت رائج رہی ہوگی جس میں عورتوں کی حکومت تھی، دیوتاؤں کی جگہ دیویوں کی پرستش ہوتی تھی اور ترکہ باپ سے بیٹے کو پہنچنے کے بجائے ماں سے بیٹی کو پہنچتا تھا اور رشتہ بھی ایک حد تک اسی طرح شمار کیا جاتا تھا۔ باخوفن نے جو طریقہ ان واقعات کو قدیم کتابوں اور رسوم و قوانین وغیرہ سے ثابت کرنے کا اختیار کیا وہ یقیناً صحیح تھا اس سے علم الاقوام کی مزید تحقیقات کو بہت تقویت پہنچی اور علاوہ شمال مشرقی امریکہ کے "اصلی باشندوں" کے جن کا ذکر پادری لافیتو نے کیا ہے دوسری قوموں میں بھی جو اب تک موجود ہیں اس قسم کی رسموں کا پتہ چلایا گیا ہے۔

باخوفن کے مشاہدات بلاشبہہ صحیح تھے۔ مگر اس نے ان کی جو تعبیر کی وہ کئی لحاظ سے ناقص تھی۔ اس کی بحث کا لب لباب قریب قریب ان الفاظ میں بیان کیا جا سکتا ہے۔ کلاسیکل عہد سے پہلے عورتیں حاوی تھیں۔ کلاسیکل عہد میں یونان میں ان کی حیثیت کم ہو گئی۔ چونکہ یورپ اسی عہد کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے اس لئے باخوفن کے زمانے تک یورپ میں بھی قدیم یونان کی طرح عورتیں مردوں سے کم تر اور اُن کی دست نگر سمجھی جاتی تھیں۔ اور انھیں عمومی معاملات میں حصہ لینے کی، کوئی ذہنی کام یا کسی قسم کا ذمہ داری کا کام کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ ایک ایسے معاشرے کی آزاد اراکین نہیں سمجھی جاتی تھیں جس میں اصولاً ہر فرد کو بلا تفریق جنس یکساں حقوق حاصل ہیں اور اس پر یکساں فرائض عائد ہوتے ہیں۔ اس سے اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ (الف) مادری حکومت کا تصور یونان کی طرح ساری دنیا میں پدری حکومت سے قدیم تر ہے اور (ب) پدری حکومت کا اصول "قدرتی طور پر" زیادہ بلند، متمدن اور ترقی یافتہ ہے۔ ان دونوں مفروضات پر جو غیر صحیح اور غیر منطقی ہیں، لیکن اس شخص کو جو پدری حکومت کے نقطۂ نظر سے ہر چیز کو دیکھنے کا عادی ہو گیا ہے بظاہر بالکل قدرتی معلوم ہوتے ہیں۔ نظریات کی پوری عمارت کھڑی کر دی گئی ہے۔ ہم ان خیالات کا ایک خاکہ یہاں پیش کریں گے اس لئے کہ نصف صدی تک تاریخ انسانی کے نظریات پر اس کا بہت اثر پڑتا رہا۔ اور اب بھی عام لوگ ابتدائی معاشرت، حکومت مادری اور عورتوں کی موجودہ حیثیت کے متعلق جو رائے رکھتے ہیں اس پر اس کا بہت کچھ اثر پڑ رہا ہے۔

باخوفن نے ایک حد تک وہ قدیم یونانی نظریہ اختیار کیا جو ڈیکائی آرکس نے قائم کیا تھا۔ اس میں انسان کے تہذیبی ارتقا کی تین منزلیں فرض کی گئی تھیں :-

(الف) وہ منزل جس میں انسان شکار کرتا تھا اور اپنے لئے غذا جمع کیا کرتا تھا (ب) وہ منزل جس میں کہ وہ مویشی پالتا تھا (ج) وہ منزل جس میں کہ وہ ایک جگہ بس کر کاشت کرنے لگا۔ باخوفن نے بڑی قابلیت کے ساتھ یہ نکتہ دریافت کیا کہ کاشتکاری کا علم اور فن یقیناً اُن معاشروں نے ایجاد کیا ہوگا۔ جن میں مادری حکومت کا رواج تھا۔ علم الاقوام کے آیندہ مشاہدات اور تعبیرات سے اس مفروضے کی تائید ہوئی۔ اس نقطۂ نظر سے باخوفن اگر چاہتا تو وہ ان واقعات کی صحیح علمی تعبیر کر سکتا تھا۔ مگر وہ اس میں کامیاب نہ ہوا۔ سیّاحوں اور تحقیقی سفر کرنے والوں نے دنیا کے بہت سے مقامات سے یہ خبریں پہنچائیں کہ ان معاشروں میں جہاں حکومت مادری کا رواج ہے عورت ایک ہی وقت میں کئی مردوں سے شادی کر سکتی ہے اور کنّواری لڑکیاں اگر عاشقانہ چھیڑ چھاڑ کریں تو ان سے اسی طرح چشم پوشی کی جاتی ہے جیسے کنّوارے لڑکوں کی ان حرکتوں سے۔ یہ چیز اہل یورپ کی روایات کے لحاظ سے بہت مذموم تھی۔ اسی کے ساتھ ان میں یہ مادّہ نہ تھا کہ اپنے جذبات کو الگ کر کے بے تعصبی کے ساتھ دوسروں کے جذبات۔ احساسات اور دوسروں کی تہذیبی روایات کا مطالعہ کر سکتے۔ اس کے برعکس وہ اخلاقی معیار کو کام میں لاتے تھے۔ اور واقعات کو مخالفانہ نظر سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ ان قوموں کو جن

ہیں حکومتِ مادری کا رواج تھا "وحشی" "غیر متمدن" بلکہ بہائم کے برابر سمجھتے تھے، حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ ابھی ایک صدی کی بات ہو کہ اچھی تہذیب یافتہ قوموں مثلاً ہندستان کے اکثر مالا باریوں، چین کی تبتی اور میاؤ قوموں، شمالی افریقہ کے تماشکوں اور مشرقی افریقہ کے سائیوں میں بھی یہی رسم جاری تھی۔ اس کا رواج اب بھی بعض قوموں میں پایا جاتا ہو جو اگرچہ جاہل ہیں مگر خاصی مہذب ہیں مثلاً اسکیمو، افریقہ کے بعض قبائل اور آسٹریلیا کے ملانیشی، ارنٹی اور ڈیری۔ لیکن یہ سائنس داں انتہائی ارتقائیت سے اس قدر مُتاثّر تھے کہ وہ ان قوموں کی معاشرت کو "فطری ارتقا" کی ایک منزل سمجھتے تھے جس سے کہ اور سب قومیں بھی گزر چکی ہیں۔ چنانچہ ان قوموں پر جو اعتراض تھا وہ یہ تھا کہ وہ اب تک انسانی ارتقا کی "ابتدائی منزل" میں ہیں۔ ان ارتقائیوں کو خود اپنے رسم و رواج پر اس قدر ناز تھا کہ اُن کے خیال میں شادی بیاہ کے جو قاعدے پدری حکومت پر مبنی معاشرے میں رائج ہیں وہ ایک طویل دورِ ارتقا کے بعد وجود میں آئے ہوں گے، اس لیے باخوفن اس نتیجہ پر پہنچا کہ:۔ (الف) ابتدا میں انسان اس منزل پر ہوں گے جب کہ جنسی تعلقات میں بالکل آزادی تھی۔ لوگ شادی کے نام تک سے ناواقف نہ تھے اور مباشرت اور استقرارِ حمل میں کوئی تعلق نہیں سمجھا جاتا تھا۔ (ب) دوسری منزل اس مادری حکومت پر مبنی معاشرت کی ہو گی جس میں کہ لوگوں نے کاشتکاری اور حضری زندگی سیکھی اور خاندان کا مرکز گھر والی کی ذات بن گئی۔ اس کے کئی مرد ہوتے تھے۔ لیکن جنسی تعلقات میں آزادی نہیں تھی، بلکہ

باقاعدہ شادی کرنی پڑتی تھی۔ (ج) حکومتِ پدری پر مبنی معاشرت جسے وہ انسانی ارتقا کی آخری منزل سمجھتا تھا۔

موجودہ باب میں ہم اس نظریے پر تنقید نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ یہاں خود علم الاقوام کے مسائل سے بحث نہیں ہو بلکہ اُن کی دریافت اور تعبیر کی تاریخ سے۔ صرف اتنا کہ دینا کافی ہوگا کہ علمی تحقیق سے جو واقعات معلوم ہوئے ہیں وہ اس نظریے سے اور اسی قسم کے دوسرے نظریوں سے مطابقت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ بہت سے حکومت پدری پر مبنی معاشرے بالکل ابتدائی حالت میں اور بہت سے حکومت مادری پر مبنی معاشرے شہری تہذیب کی منزل میں پائے گئے ہیں جن میں سے بعض اب بھی موجود ہیں اور بعض کا آثارِ قدیمہ کی تحقیق سے پتہ چلا ہو۔ اس کے علاوہ اصلی یا ابتدائی تہذیب کے جو حقیقی نمونے پائے گئے ہیں ان کے یہاں نہ حکومت پدری ہو نہ حکومت مادری۔ خیر، اس کی بحث آگے آئے گی۔

اب ہمیں یہ دکھانا ہو کہ باخوفن کی تصانیف کا علم الاقوام کی آئندہ نشو و نما پر کیا اثر پڑا۔ امریکا کے ایک بہت لائق شخص لیوس مارگن نے جسے ہم علم الاقوام کا پہلا باقاعدہ ماہر کہ سکتے ہیں، مادری حکومت پر مبنی معاشرے کی عملی تحقیق کی۔ اس نے دوبارہ شمال مشرقی امریکا کے اروکوس قبائل کا مطالعہ کیا جنھوں نے، جیسا کہ ہم پہلے کہ چکے ہیں، ۱۷۲۴ء میں فرانسیسی یسوعی لافیتو کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ مارگن مدتوں ان کے ساتھ رہا مگر اس نے کبھی ان کو

اپنے مذہب میں لانے کی کوشش نہیں کی حالانکہ وہ خود مذہب کا پابند
تھا بلکہ اُن میں ایسا گھل مل گیا کہ اُنھوں نے اُسے اپنی مذہبی انجمنوں میں
شریک کرلیا۔ اس کے مشاہدات بہت وسیع اور قیمتی تھے لیکن جو پیچیدہ
نتائج اس نے اپنی کتاب "قدیم معاشرہ" (اشاعت ۱۸۷۷ء) میں
نکالے ہیں وہ باخوفن کے غلط نتائج سے کچھ بہتر نہ تھے۔ اس نے
وحشیانہ زندگی سے لے کر کامل تہذیب تک جو اس کے خیال میں
صِرف یورپ اور امریکا میں پائی جاتی ہے، آٹھ مدارج قرار دیے۔ اس
طرح اس نے باخوفن کی بنیادی غلطی کو تو اور دور تک پہنچا دیا لیکن
اس کے اس نظریے کو قبول نہیں کیا کہ مادری حکومت اور کاشتکاری
میں باہم تعلق پایا جاتا ہے حالانکہ وہ یقیناً صحیح ہے۔ آگے چل کر مارگن نے
پولینیشیا میں بہت قابلِ قدر تحقیقات کی اور رشتہ داری کی اُس خاص
تقسیم کا مطالعہ کیا جس کی رُو سے ماں اور خالہ، باپ اور چچا کے لیے
ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے۔ ایک اور مسئلہ جس پر اس نے بحث
کی، یہ ہے کہ پولینیشیا میں رشتے کے بھائی بہنوں کی شادی، جس کو
ہندستانی معاشرت میں بھی بہت اہمیت حاصل ہے، کیا معنی رکھتی
ہے۔ اس کے مشاہدات کا مجموعہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے جس کا عنوان
ہے "انسانی خاندان میں خون کے رشتے اور ناتے"۔

اس کے بعد قوموں کی زندگی کا مطالعہ کرنے والوں، علم الانسان
اور علم الاقوام کے ماہروں میں سے اکثر نے خصوصاً انگلستان، فرانس اور
جرمنی میں، اپنے نظریات کی بنیاد ارتقائی تصوّرات پر رکھی جن کا ذکر
ہم اوپر باخوفن اور مارگن کے نظریوں کے سلسلہ میں کرچکے ہیں۔

علم الاقوام کے یہ ماہر ارتقائی کہلاتے ہیں۔ اور ان سے انیسویں صدی کا اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدا ہوتی ہے۔ چونکہ علم الاقوام کی تحقیقات کے اس مختصر بیان میں اس کی گنجایش نہیں کہ اہم ترین اشخاص کے نظریات اور تصورات کا تو ذکر کیا ہے ان سب کے نام بھی دیے جاسکیں، اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے ہم ان ارتقائیوں کے خاص خاص نظریات کو مجموعی طور پر بیان کر دیں اور پھر چند ایک نام اور سنہ گنوا دیں۔

سب ارتقائی بنی نوع انسان کو ایک یک رنگ جماعت سمجھتے تھے جس میں صرف ارتقا کے مختلف مدارج کا فرق تھا۔ یہ ارتقا ان کے خیال میں ایک قدرتی قانون یعنی قانون قوت کے مطابق ہوتا ہے۔ وہ سمجھتے تھے کہ قانون ارتقا انسانوں کو برابر بلند سے بلند تر مدارج پر پہنچاتا رہتا ہے۔ یہ وہ خوشگوار خواب ہے جسے آج کل کے انسانوں کو دیکھ کر ایک معمولی آدمی بھی مشکل سے حقیقت مانے گا۔

خلاصہ یہ کہ انتہا پسند ارتقائی بھی یہ جانتے تھے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں انسانی جماعتوں میں بہت بڑا فرق ہے مگر وہ اُسے اُن کے جداگانہ تاریخی حالات کا نتیجہ نہیں بلکہ ارتقا کی منزلوں کا فرق سمجھتے تھے۔ مثلاً جب وہ غربی افریقہ کے سوڈانی شہروں کا مقابلہ ملانیشی قوم کے گانووں سے کرتے تھے تو وہ اس نتیجے پر پہنچتے تھے کہ غربی افریقہ کے لوگ بھی کسی زمانے میں ملانیشی یا ملانیشیوں سے مشابہ رہے ہوں گے اور ملانیشی چند صدی کے عرصے میں قدرتی ارتقا کی بدولت اس حالت پر پہنچ جائیں گے جو اب غربی افریقہ والوں کی ہے۔ ان

کے نزدیک یہ صرف زمانے اور موقع کا سوال ہے ورنہ ایک دن سب انسان وہ معاشرت، آرٹ اور مذہب کے وہی تصورات اختیار کریں گے جو اہلِ یورپ کے ہیں جنھیں وہ اس وقت تک ارتقا کے انتہائی درجے پر سمجھتے تھے۔

اس نظریے کی غیر علمی بنیاد پر تنقید شروع تو تھوڑے ہی عرصہ بعد ہو گئی لیکن عام لوگوں نے اسے اب تک تسلیم نہیں کیا ہے۔

جان لبک کی تصانیف نے ارتقائی نظریے کو پھیلانے میں بہت کچھ مدد دی، خصوصاً اس خیال کو کہ مذہب نے بے جان اشیا کی پرستش سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ نشو و نما پائی۔

اسپنسر بھی مذہب کے تقابلی مطالعہ میں نمایاں حیثیت رکھتا ہے۔ میکلینن اگرچہ اوّل سے آخر تک ارتقائی تھا لیکن اس نے مارگن کی اس بات کی مخالفت کی کہ اس نے انسانی ارتقا کو میکانکی طور پر آٹھ منزلوں میں تقسیم کر دیا۔ میکلینن نے علم الاقوام کے مشاہدات اور اصطلاحات میں یہ اضافہ کیا کہ ٹوٹم[۱] کا تصور پیش کر کے اس کی تحلیل کی اور یہ بھی بتایا کہ تہذیب انسانی کی تاریخ میں قبیلے کے باہر شادی کرنے کا دستور کیا اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا یہ خیال تھا کہ ایک عورت کا کئی مرد کرنا شادی کی ابتدائی صورت رہی ہو گی۔

ویسٹر مارک نے "رسم شادی کی تاریخ" کے نام سے جو بنیادی کتاب لکھی اس میں اس خیال کی مخالفت کی کہ ہر قوم لازمی طور پر

---

[۱] مظاہر فطرت میں سے کوئی چیز خصوصاً کوئی جانور یا پودا جسے شمالی افریقہ کے دیسی قبائل باطنی تعلق کے عقیدے کی بنا پر اپنا نشان قرار دیتے ہیں۔

حیوان نما انسانوں سے (جن کا کہیں پتہ نہیں چلتا) رفتہ رفتہ کامل مہذب معاشرے تک ترقی کرتی ہے۔ اس نے اس خیال کو بھی مشتبہ قرار دیا کہ ابتدائی قوموں میں "بے قید جنسی تعلقات" موجود تھے، اس لیے کہ اس کا مطلق کوئی ثبوت موجود نہیں۔

فریزر کو بھی اسی گروہ میں شامل کرنا چاہیے اگرچہ وہ بڑی حد تک اس کی حدود سے باہر نکل گیا تھا۔ اس کی مشہور کتاب "شاخ زریں" میں کلاسکی عہد کے مشاہدات سے بھی بہت کام لیا گیا ہے۔ "ٹوٹم اور قبیلے کے باہر شادی کرنے کا دستور" اس کی ایک اور کتاب ہے جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی۔ اس نے قبیلے کے باہر شادی کرنے کے دلچسپ دستور کی توجیہہ کرنے کی تین کوششیں کیں جو کچھ تو ارتقا کے نظریے پر مبنی تھیں اور کچھ نفسیات پر۔ چنانچہ اس کا یہ خیال تھا کہ ٹوٹم کی پرستش یا حرمت (جو نہ صرف وسط ہند اور دکن کی بعض ذاتوں میں یہاں تک کہ بعض تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی پائی جاتی ہے بلکہ دنیا کے اکثر حصوں میں موجود ہے) اس عقیدے پر مبنی ہے کہ جو جانور انسانوں کے لیے اہمیت رکھتے ہیں اُن میں سے کسی ایک کو علامت کے طور پر یعنی ٹوٹم کی شکل میں پوجنے سے کچھ ایسا جادو کا اثر پڑتا ہے کہ جانوروں کی نسل اور پیداوار بہت بڑھ جاتی ہے۔

شاید اس سے بھی زیادہ اہم ٹیلر کا معتدل ارتقائی نظریہ تھا۔ اس نے علم الاقوام کے تصورات میں آثار باقیہ کے اہم تصور کا اضافہ کیا۔ اس سے مراد ہے کسی قدیم تہذیب کے بچے کھچے آثار جن کی اصل کو لوگ بھول گئے ہیں لیکن گہری نظر سے مشاہدہ کرنے والا تحلیل کے

ذریعے اُن کا پتہ چلا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر وہ جبریہ شادی کا ذکر کرتا ہے جس کے آثار ایک بے معنی رسم کی شکل میں بہت سی قوموں میں چنانچہ ہندوستان کی بعض ذاتوں میں بھی پائے جاتے ہیں جن کی موجودہ تہذیب کا معیار اتنا بلند ہے کہ سچ مچ دولھا کا دُلھن کو پکڑ کر لے جانا ممکن ہے۔ لیکن شادی کی رسوم اب تک اسی انداز کی ہیں کہ گویا دولھا دُلھن کو زبردستی چھین کر لے جا رہا ہے اور دُلھن اس کی فریاد کر رہی ہے، حالانکہ حقیقت میں شادی کم سے کم دولھا دُلھن کے والدین کی رضامندی سے ہوتی ہے۔ اس کی ایک اور قابل قدر دریافت "وابستگی" کا اصول ہے۔ اس کا یہ دعویٰ ہے کہ ہم اعداد و شمار کے ذریعے سے قدیم تہذیب کے اُن عناصر میں جو اب تک موجود ہیں باہمی علاقہ معلوم کر سکتے ہیں۔ مثلاً کئی ابتدائی قوموں میں ساس اور داماد یا دوسرے عزیزوں میں باہم پردے کا دستور ہے (کہیں کہیں تو دن کے وقت میاں بیوی بھی ایک دوسرے سے پردہ کرتے ہیں)۔ ٹیلر کا کہنا یہ تھا کہ اگر یہ رسم اُن قوموں میں جن کے یہاں پدری حکومت ہے کم اور اُن قوموں میں جہاں مادری حکومت ہے زیادہ رائج ہے تو یہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی ابتدا آخر الذکر نے کی ہوگی۔

گو یہ نتیجہ ہمیشہ صحیح نہ ہو پھر بھی اس نظریے کی بدولت علم الاقوام کو بہت ترقی ہوئی۔ اس لیے کہ اسی نظریے نے پہلی بار اس اہم حقیقت کو تسلیم کیا کہ بعض اوقات تہذیبی عناصر اس کے باوجود کہ ان کی کوئی عملی اہمیت باقی نہ رہی ہو، برقرار رہتے ہیں اور بعض اوقات باوجود مفید ہونے کے ختم ہو جاتے ہیں۔ ٹیلر کا اعداد و شمار کا طریقہ خواہ عمل

میں ناقص ہی کیوں نہ ثابت ہوا ہو مگر اس میں شک نہیں کہ اس نے علم الاقوام میں تحلیل کے ایک بہتر علمی طریقے کی راہ دکھائی۔

فرانس میں علم الاقوام کے ماہروں کا وہ مذہب جو سراسر ارتقائی تھا عمرانیات کے طریقۂ تحقیق پر مبنی تھا۔ ان حضرات کو معاشرے سے اس قدر دلچسپی ہے کہ انھوں نے ان قوموں میں بھی جو ابتدائی کہلاتی ہیں فرد کی اہمیت کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کا ایک بڑا اصول اس مقولے سے ظاہر ہوتا ہے۔ "فرد کا وجود ہی نہیں"۔ ان کے نزدیک ابتدائی معاشرے کا انسان ہر چیز کو اجتماعی نقطۂ نظر سے دیکھتا تھا۔ مذہب کو اُنھوں نے محض ایک اجتماعی وظیفہ یا معاشرے کی تنظیم اور حکومت کا ذریعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان میں سب سے ممتاز اور بین الاقوامی شہرت رکھنے والا لیوی برول ہے۔ وہ اس خیال کا بانی ہے کہ ابتدائی انسان کا ذہن ایک قبل منطقی حالت میں تھا یعنی نہ تو وہ واقعات سے نتیجہ نکال سکتا تھا اور نہ اپنے تجربے سے فائدہ اٹھا سکتا تھا بلکہ بعض مفروضہ علامات کے سہارے چلتا تھا جو عموماً اشیا کی باہمی مشابہت پر مبنی ہوتی تھیں۔ مثلاً اگر وہ دیکھتا تھا کہ خون زندگی کا حامل ہے اور زخمیوں کے جسم سے خون نکل جانا ہلاکت کا باعث ہوتا ہے تو سرخ رنگ اس کے نزدیک زندگی، تخلیق اور محبت کی علامت بن جاتا تھا۔ یا اگر (جیسا کہ آسٹریلیا کے ارنڈہ قبیلے کا عقیدہ ہے) بنجر صحرا کے بیچ میں کوئی درخت یا جھاڑی حیات نامیہ کے تصور کی علامت بن گئی ہو تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اس درخت یا جھاڑی کے قریب پہنچ کر عورتیں حاملہ ہو جاتی ہیں۔ یا آسٹریلیا کے ایک اور قبیلے کی مثال لیجیے۔

جب اس قبیلے کے لوگوں کو یہ بات معلوم ہوگئی کہ بیٹا باپ کے نطفے سے پیدا ہوتا ہی تو وہ یہ سمجھنے لگے کہ اگر کسی شخص کا لڑکا بہت دور صحرا میں بیمار ہو اور اس کا باپ مشن کے مقام پر آ کر اس کے لیے دوا لے اور خود کھالے تو اس سے بیٹے کو فائدہ ہوگا۔ لیوی برول کا یہ بھی خیال تھا کہ جادو کا عام عقیدہ اور عمل اور ٹوٹم کے تصور کے ماتحت انسانوں کا بعض جانوروں یا بے جان چیزوں سے تعلق، یہی وہ بنیاد ہی جس پر آگے چل کر مذہب کی عمارت کھڑی ہوئی۔

درکائین، ماس اور وان ژینپ فرانس میں لیوی برول کے پیرووں میں سب سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں اگرچہ انھوں نے اپنے مشاہدات میں بہت، باریکی سے اور ان کی تعبیریں بڑی قابلیت سے کام لیا ہی، لیکن اُن کے نتائج حقیقت پر مبنی نہیں ہیں۔ اگر ہم ایک ابتدائی قبیلے کے دو شخصوں سے گفتگو کرتے ہیں تو یہ دیکھتے ہیں کہ اُن میں زمین آسمان کا فرق ہی۔ گو اُن کی قوت استدلال بعض تعصبات کی وجہ سے (جن کی لکھنے پڑھنے والی قوموں میں بھی کمی نہیں) بہت محدود ہوتی ہی پھر بھی وہ منطقی نتائج نکالنے سے معذور نہیں ہوتے اس کے علاوہ ۱۹۰۰ء میں اینڈریو لینگ اپنی تحقیقات کی بنا پر یہ کہہ چکا ہی کہ خاص طور پر ان قبائل میں جو بالکل ابتدائی سمجھے جاتے ہیں خدا کی وحدانیت کا عقیدہ صاف طور سے پایا جاتا ہی۔ یہ چیزیں ہیں جنھیں لیوی برول (جس نے خود کبھی واقعات کا مشاہدہ نہیں کیا) اور اس کے پیرووں نے نظر انداز کر دیا ہی۔

علم الاقوام کے تقابلی طریقے کو جس کے اشارات ٹیلر کے نظام

میں بھی ملتے ہیں ایک جرمن ماہر فریدرش راتسل نے بہت قابلیت سے پیش کیا۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے بیسٹین کے سراسر ارتقائی نظریے کی، جس کا خلاصہ ہم اوپر دے چکے ہیں، مخالفت کی۔ بیسٹین کا یہ خیال تھا کہ انسانی تہذیب کا ارتقا دنیا کے تمام حصوں میں مجموعی طور پر یکساں ہوتا ہے، مگر راتسل نے ہجرت یعنی قوموں، تہذیبوں یا متفرق تہذیبی عناصر کے ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کی طرف توجہ دلائی۔ وہ پہلا شخص تھا جس نے ابتدائی قبیلوں کے باہمی تاثیر و تاثر کی ناقابل انکار اہمیت پر زور دیا۔ یہ اسی کا مشاہدہ تھا جس کا ذکر ہم نے پہلے باب میں کیا ہے کہ ملانیشی قبائل اور مغربی افریقہ کے قبائل کے تیر کمان میں حیرت انگیز مشابہت پائی جاتی ہے۔ اس کا استدلال یہ تھا۔ چونکہ دونوں جگہ کمان کے بیرونی حصے کا چپٹا اور اندرونی حصے کا خمدار ہونا اور تانت کے لگانے کا یہ مخصوص طریقہ اس شے کی نوعیت کے لحاظ سے ضروری نہیں تھا جس سے کہ یہ کمان بنتی تھی اس لیے اس مشابہت کی توجیہہ صرف قبائل کی ہجرت ہی کے ذریعہ سے کی جا سکتی ہے خصوصاً اس وجہ سے کہ ان دونوں قوموں میں جو ایک دوسرے سے اس قدر فاصلے پر رہتی تھیں اور بھی بہت سی چیزوں میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔

فریدرش راتسل کی ایک اور اہم خدمت یہ ہے کہ اس نے خانہ بدوش گلہ بانوں کو خصوصاً ان کو جو سائبیریا اور وسط ایشیا میں پائے جاتے ہیں، ابتدائی قبائل کی ایک جداگانہ قسم قرار دیا جن کا شمار نہ تو ابتدائی شکاری قبائل میں کیا جا سکتا ہے اور نہ سب سے پہلے زراعت

پیشہ قبائل ہیں۔

لیوف۔ روبینیس بارہ مہیں لے کر افریقہ گیا اور ان سب میں کامیاب ہوا۔ اس نے افریقہ کی تہذیبوں میں مادری حکومت اور پدری حکومت کے فرق پر زور دیا اور علم الاقوام کی نظری معلومات اور نظام میں بہت کچھ اضافہ کیا۔ راتسل کا یہ خیال تھا کہ جو تہذیبی خصوصیت مختلف قوموں میں مشترک طور پر پائی جاتی ہے اس کی نوعیت یہ ثابت کرتی ہے کہ وہ ایک ہی مرکز سے نکل کر مختلف مقامات پر پھیلی ہے اور اگر دو قوموں میں اس قسم کی بہت سی مشترک باتیں پائی جاتی ہوں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ صرف دو ایک تہذیبی عناصر ہی نہیں بلکہ پوری تہذیب ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچی ہے۔ اس طرح اس نے ایک ایسے طریقہ تحقیق کی بنیاد ڈالی جو اعداد و شمار پر بھی مبنی تھا اور جغرافیہ پر بھی اور جس کی بدولت تہذیبی خطوں یا دائروں کا تصور پہلے پہل وجود میں آیا۔

فرتس گریبنر نے جو دراصل ایک باقاعدہ تاریخ داں تھا، ان سب مشاہدات کی بنا پر تاریخ تمدن کے نقطہ سے علم الاقوام کی تحقیقات کا ایک معقول نظام قائم کیا۔ اسے اس نے اپنی کتاب "علم الاقوام کا طریق تحقیق" میں بیان کیا ہے جو سنہ ۱۹۱۱ء میں جرمن زبان میں شائع ہوئی۔ اگرچہ اس کے خیالات اور نتائج بہت واضح اور مفید ہیں، لیکن اس کا اسلوب بیان اس قدر پیچیدہ اور مغلق تھا کہ غیر ملکی تو درکنار خود جرمن بھی عام طور پر اس کا مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ علم الاقوام کے ماہر عموماً انگریز، فرانسیسی، امریکی یا روسی ہیں جنھیں مدتوں سے قدیم نسلوں سے سابقہ رہا ہے اس لیے گریبنر کی کتاب کا یہ بہت بڑا عیب

ہے کہ وہ خواہ مخواہ اس قدر مشکل زبان میں لکھی گئی جسے یہ لوگ نہیں سمجھ سکتے۔ غالباً اسی وجہ سے اس کا ترجمہ دوسری زبان میں نہیں ہوا اور بین الاقوامی محققوں نے اس کی اہمیت کو تسلیم نہیں کیا۔

صرف وائنیا پایۂ تخت آسٹریا کے ماہرین علم الاقوام کی جماعت نے اس کتاب کی قابل قدر تجاویز سے فائدہ اٹھایا۔ اس جماعت کے تین سب سے اہم نمائندے پادری و۔ اشمت اور پادری د۔ کاپرس اور بیرن رابرٹ ہائینے گیبلڈرن ہیں۔

ان سب لوگوں نے تہذیبی دائروں کا ایک مکمل نقشہ بنایا۔ یہ تصور ان تہذیبی نمونوں کا ہے جن کا دائرہ آج کل کسی ایک جغرافی خطّے تک محدود نہیں ہے بلکہ سارے کرۂ ارض پر پھیلے ہوئے ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم آگے چل کر دکھائیں گے وہ ابتدا میں ضرور کسی خاص جغرافی علاقے میں پیدا ہوئے ہوں گے۔ فرتس گریبزہی نے سب سے پہلے ان بنیادی تہذیبی دائروں اور ایک مشترک اصلی تہذیب کا نظریہ پیش کیا۔

یہ نظریہ امریکا کے بہت سے بڑے بڑے محققوں کے خیالات اور تصورات سے مطابقت رکھتا ہے جن میں سے چند کے نام یہ ہیں:۔ فرانس بواس، ساپر، کریبر، راڈن، گولڈن وائیزر، لوئی، برنٹن، پاویل، کلارک وسلر۔ ظاہر ہے کہ امریکا کے علم الاقوام کو زیادہ تر خود امریکا کے اصلی باشندوں سے سروکار رہا مگر چونکہ اس براعظم پر انسان مقابلتہً دیر میں آباد ہوئے اور زیادہ تر سائبیریا سے آئے اس لیے وہاں کے اصلی باشندوں میں تہذیبی نمونوں کی تفریق مشکل ہے۔ اسی

وجہ سے امریکا کے ماہرین علم الاقوام کا رجحان اصلی تہذیبی دائروں کے بجائے جغرافی تہذیبی خِطّوں کی طرف زیادہ رہا۔ اس کے علاوہ انھوں نے معاشرتی یا مذہبی رسوم و ادارات کی عملی صورتوں کی اہمیت پر بھی بہت زور دیا۔ اس نظریے سے جو نظریۂ اعمال کہلاتا ہے، ہم اگلے باب میں بحث کریں گے اور یہ دکھائیں گے کہ وہ تاریخ تمدن پر مبنی طریقہ تحقیق کے صحیح تصور سے بہت کچھ مطابقت رکھتا ہے۔ برطانوی ماہر علم الاقوام برونس لا ئیلی ناؤسکی نے اس طرز تحقیق کی تنظیم اور توسیع کر کے اسے غیر ملکی تہذیب و تمدن کے مطالعہ اور تحلیل کا ایک ہمہ گیر ذریعہ بنا دیا۔

نتیجہ

اس بات کو صاف کر دینے کی ضرورت ہے کہ اس باب میں جو علم الاقوام کی تاریخ پر لکھا گیا ہے بڑے بڑے ماہرین علم الاقوام کے خیالات تو درکنار ان کے ناموں تک کی مکمل فہرست موجود ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ اُن میں جو اہم ترین شخصیتیں گزری ہیں ان کی تعداد بھی اس قدر زیادہ ہے کہ اس سرسری مطالعہ میں اُن کے کارناموں کا ذکر نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کتاب کے پڑھنے والوں پر اس سے پہلے کہ وہ نفس مضمون کو سمجھیں اور زیادہ ناموں اور نظریوں کا بوجھ لاد دیا جاتا تو یقیناً اُلجھ کر رہ جاتے۔ سچ پوچھیے تو ایک حد تک یہ عیب اب بھی موجود ہے مگر دوسری طرف یہ بھی ضرور تھا کہ طریق بحث کے بیان سے پہلے جو اگلے باب میں آئے گا اس بات کی طرف اشارہ کر دیا جائے

کہ اس بارے میں ماہرین علم الاقوام کے طرز خیال میں کیا کیا تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔

ابتدائی اقوام کے علمی مطالعہ یعنی علم الاقوام کی تاریخ کے مندرجہ ذیل دور قرار دیے جا سکتے ہیں۔

(الف) ابتدا میں محقق غیر قوموں کی زندگی کا مقابلہ خود اپنے آبا و اجداد اور ان کی روایات کی تاریخی نشو و نما سے کیا کرتے تھے۔ لیکن نہ تو اُن کا کوئی باقاعدہ اصول تھا اور نہ وہ تفصیلات سے پوری طرح واقف تھے۔

(ب) دوسرے دور میں تاریخ طبیعی یا تاریخ فطرت کے نتائج کو بنی نوع انسان کی تمدنی تاریخ پر عاید کیا جاتا تھا۔ یہ طریقہ بے شمار غلطیوں کا باعث ہوا اور اسے ہم صحیح علمی طریقہ نہیں کہہ سکتے۔ اسی کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہوا کہ ابتدائی قومیں "وحشی"، "بہیمی" اور "نیم انسان" تھیں جو سراسر غلط ہے۔ چونکہ اس تصوّر سے "مہذب" قومیں جو لکھنا پڑھنا جانتی ہیں خوش ہوتی ہیں اسی لیے یہ عوام میں اتنا مقبول ہے اور ان نظریوں کے مقابلے میں اب تک موجود ہے جو علمی اور اخلاقی حیثیت سے اس سے کہیں بہتر ہیں۔

(ج) آخری دور میں علم الاقوام کی تحقیقات زیادہ تر تاریخ تمدن سے کام لیتی ہے اور مختلف تہذیبوں کے باہمی تعلق پر زور دیتی ہے۔ تقابل اور تحلیل کا طریقہ اگرچہ وہ مختلف طرز خیال کے لوگوں کے یہاں مختلف ہے علمی اصول کے مطابق کام میں لایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ سے یہ خیال پیدا ہو گیا ہے کہ نوع انسانی یقیناً اپنی اصل میں متحد ہے اور اپنے مظاہر میں مختلف، اور علم الاقوام کی تحقیقات سے عام تاریخ تمدن کو بھی بہت کچھ فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

تیسرا باب
علم الاقوام کا طریق تحقیق
جو تاریخ تمدن پر مبنی ہے

علم الاقوام کے اس طریق تحقیق کے بارے میں جس کا ہم ذکر کر رہے ہیں، نہ تو یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ وہی ایک واحد طریقہ ہے اور نہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بالکل مکمل ہے اور اس میں کسی ترمیم کی گنجائش نہیں۔ سچ پوچھیے تو وہ مزید اصلاح و ترقی کے چند اشارات کا مجموعہ ہے۔ لیکن اس تاریخی طریقے میں، جو وائنا کے ماہرین علم الاقوام سے منسوب ہے، بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ کسی من مانے نظریے کی بنا پر نوعِ انسانی کی ابتدا اور ارتقا کی ایک خیالی عمارت بنا کر نہیں کھڑی کر دیتا بلکہ ہر قدم پر مسلّمہ واقعات سے سروکار رکھتا ہے۔ اس طرح ہر ایک محقق اپنی رائے سے کام لے سکتا ہے اور اپنے پیشرووں کی غلطیوں کی اصلاح کر سکتا ہے۔ انشاءاللہ اگر علم الاقوام کے محققوں کو اس کا موقع ملا کہ جو چند قدیم اصلی قومیں دنیا میں باقی رہ گئی ہیں ان کا مطالعہ کریں، قبل اس کے کہ وہ جدید تہذیب کی چیرہ دستیوں سے پامال ہو کر پرولتاری بن جائیں، تو ہمارے اکثر موجودہ نظریات و تصوّرات کی تصدیق ہو جائے گی۔

علم الاقوام کے اس طریق تحقیق کی تفصیلات بیان کرنے سے پہلے ہم اس بات پر غور کریں گے کہ علم الاقوام کا سب سے اہم مقصد کیا ہے۔

یہاں ہمیں "علم الاقوام" اور "مطالعہ اقوام" میں باہم خلط مبحث نہیں کرنا چاہیے۔ مطالعۂ اقوام میں "ابتدائی" قوموں یعنی ان قوموں کے جنھوں نے ابھی تک لکھنا پڑھنا نہیں سیکھا، صرف حالات بیان کر دیے جاتے ہیں، علم الاقوام میں ان واقعات کی جو مطالعۂ اقوام کے ذریعے جمع کیے گئے ہیں، توجیہہ کی جاتی ہے۔

اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ علم الاقوام اُن علوم میں سے ہے جو ذہنِ انسانی اور اس کے کارناموں سے بحث کرتے ہیں۔

یہ ایک تاریخی علم ہے اور اس میں اُن قوموں کی تاریخ معلوم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کے گزشتہ حالات لکھے ہوئے موجود نہیں ہیں اور جو خود اپنی تاریخی روایات سے ناواقف ہیں۔

علم الاقوام ایک قسم کی تاریخ تمدن ہے۔ لیکن ابتدائی قوموں کی تاریخ میں لڑائیوں اور سرداروں کے حالات وغیرہ کو اتنی اہمیت نہیں دی جاتی جتنی ان کے نظامِ معاشرت، مذہب، صنعت اور آرٹ کو یا ان اثرات کو جو اُنھوں نے ایک دوسرے پر ڈالے اور اُن تعلقات کو جو وہ "پوری مہذّب" قوموں سے رکھتے ہیں۔

علم الاقوام دوسرے تاریخی علوم کو مدد دیتا ہے اور خود بھی ان سے بہت کچھ مدد لیتا ہے۔ ان علوم کی تفصیل یہ ہے۔

(الف) آثارِ قدیمہ۔ جس کی تعریف یہ کی جا سکتی ہے کہ وہ قدیم انسانی معاشروں کی تاریخ تمدن ہے جس کا پتہ پرانے شہروں وغیرہ

کی کھدائی سے لگایا جاتا ہے۔ علم الاقوام سے ہمیں یہ معلومات حاصل ہوتی ہے کہ کس طرح بعض ابتدائی قومیں پتھر کے اوزار استعمال کرتی تھیں اور کون کون سے دوسرے تہذیبی عناصر اوزاروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ شلاً کچھ دن پہلے تک آسٹریلیا کے "اصلی" باشندے ایک خاص قسم کے سیدھے سادے پتھر کے تبر جو عہد حجری کے نمونے کہلاتے ہیں استعمال کرتے تھے جو آثار قدیمہ کی تحقیقات کے مطابق فرانس اور دنیا کے اور بہت سے مقامات میں کثرت سے پائے گئے ہیں۔ جب ملانیشیا کو دریافت کیا گیا تو اس زمانے میں وہاں کے اصلی باشندے ایک خاص قسم کے صیقل کیے ہوئے پتھر کے اوزار جو عہدِ متاخر حجری کے کہلاتے ہیں، استعمال کرتے تھے جو آثار قدیمہ کے ایک دوسرے نمونے سے تعلق رکھتے ہیں۔ علم الاقوام کے ماہروں نے اس بات کا مشاہدہ کیا کہ آسٹریلیا اور ملانیشیا کے لوگ ان اوزاروں کو کس طرح بناتے ہیں اور کیونکر کام میں لاتے ہیں۔ اس معلومات سے آثارِ قدیمہ کے علم میں اضافہ ہوا۔ یہ چیز تو مطالعۂ اقوام سے تعلق رکھتی ہے - لیکن علم الاقوام نے اس سے بھی زیادہ اہم خدمت انجام دی، اس نے یہ دریافت کیا کہ اہلِ آسٹریلیا کی تہذیب ملانیشیوں کی تہذیب سے زیادہ سادی تھی اور اس میں تخصیص کا رنگ بہت کم پایا جاتا تھا۔ اس بات سے آثارِ قدیمہ کے اس نظریے کو تقویت پہنچی کہ قدیم عہدِ حجری کے اوزار اس تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں جو متاخر عہدِ حجری تہذیب کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ ہے۔ ہم ایک قدم اور آگے بڑھاکر یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ غالباً آسٹریلیا اور ملانشیا کے لوگ اس

تہذیب کا سچا نمونہ پیش کرتے ہیں جس سے اب سے دس پندرہ ہزار سال پہلے فرانس کے وہ باشندے تعلق رکھتے تھے جو اسی قسم کے اوزار بناتے تھے۔

ان میں آثار قدیمہ نے ان چیزوں کا جو کھدائی کے ذریعہ سے نکالی جاتی ہیں زمانہ متعیّن کرنے کا ایک بہتر طریقہ معلوم کیا ہی۔ آثار قدیمہ کی دریافت نہ صرف تہذیب کے مختلف نمونوں کی تقسیم کے متعلق بلکہ اُن کے زمانے کے متعلق بھی شہادت دیتی ہی۔ اس کی ایک مثال انڈس کی ترقی یافتہ تہذیب ہی، جس کا پتہ مہنجو دارو اور ہڑپا کی کھدائی کے ذریعہ سے لگایا گیا ہی۔ ان بڑے شہروں کے نقشوں، طرزِ تعمیر، اوزاروں، زیوروں اور مذہبی تبرکات وغیرہ میں جنوبی ہند کی قبل آریائی تہذیب سے بہت کچھ مشابہت اور تعلق پایا جاتا ہی، اس طرح علم آثار قدیمہ نے ہمیں اس تہذیب کا زمانہ اور وسعت معلوم کرنے میں بہت بڑی مدد دی۔ وہ اپنے خاص طریقِ تحقیق کے مطابق اس نتیجہ پر پہنچا کہ انڈس کی تہذیب اب سے پانچ ہزار سال پہلے پورے شباب پر ہوگی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہی کہ وہ قبل آریائی تہذیب جو آج کل جنوبی ہند میں رائج ہی بہت قدیم روایات پر مبنی ہی۔

(ب) طبیعی علم الانسان۔ اس کا علم الاقوام سے قریب قریب وہی تعلق ہی جو آثار قدیمہ کا ہی۔

(ج) لسانیات۔ اس کے متعلق بھی یہی بات کہی جا سکتی۔ یہ دکھانے کے لیے کہ علم الاقوام سے لسانیات کو کتنی زیادہ مدد ملتی ہی ہم صرف

ایک مثال پیش کریں گے۔ لسانیات کے بعض ماہر مدتوں سے یہ کہتے چلے آئے تھے کہ ابتدائی قومیں ایک بہت ناقص زبان رکھتی تھیں جس میں مختلف تصورات کی تفریق نہیں تھی اور جس کا لہجہ بھونکنے سے مشابہ تھا لیکن علم الاقوام کی تحقیقات سے یہ ثابت ہوا کہ جزائر فایر لینڈ کے یمانہ سیلکنم اور ہلاک لوپ قبائل جو سب سے ابتدائی تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں اُن کی زبان میں تیئس ۲۳۰۰۰ ہزار الفاظ ہیں جنھیں برجیز نے شمار کیا ہی۔ اگر ہم اس کا مقابلہ بنیادی انگریزی کے ساڑھے آٹھ سو الفاظ سے کریں جن کے دائرے کے اندر ادب کے اعلیٰ مضامین ادا کیے جا سکتے ہیں مثلاً برنڑ شا کے ڈرامے اس طرح لکھے جا سکتے ہیں کہ ان سے خود مصنف مطمئن ہو جائے تو ہمیں یہ ماننا پڑے گا کہ علم الاقوام کا صرف یہی ایک مشاہدہ اس نظریے کو غلط کر دینے کے لیے کافی ہی کہ ابتدائی قوموں کی زبان غیر ترقی یافتہ حالت میں تھی۔

ممکن ہی کہ ہندستان میں غیر اہل فن یہ کہیں کہ ملائی، تامل اور تلنگی جیسی خوشنما اور ترقی یافتہ زبانوں کو وہ جنگلی قومیں جو انہی زبانوں کے علاقے میں رہتی ہیں کس قدر بگڑی ہوئی شکل میں بولتی ہیں۔ یہ واقعہ تو صحیح ہی لیکن اس کی وجہ یہ ہی کہ یہ قومیں پہلے اپنی الگ زبانیں رکھتی تھیں جن کو چھوڑ کر انھوں نے اپنی ہمسایہ مہذب قوموں کی زبانیں یعنی ملائی، تامل اور تلنگی اختیار کر لیں، جن سے وہ پوری طرح مانوس نہیں ہو سکیں۔

(د) ادب العوام۔ یہ حقیقت میں علم الاقوام ہی کی ایک خاص شکل ہی۔ جب کوئی علم الاقوام کا ماہر خود اپنی قوم کے کسانوں، ماہی گیروں، شکاریوں، یا ادنیٰ کاریگروں کی معاشرت کا مطالعہ کرتا ہی تو اس کا نام

ادب العوام رکھ دیا جاتا ہے۔ یہاں ہم یہ کہ دینا چاہتے ہیں کہ اگر معاشرے کے اونچے طبقوں یعنی ہوا بازوں، جہاز رانوں، فوج کے سپاہیوں، فلم اور تھیٹر کے ایکٹروں، گھوڑ دوڑ یا موٹر کی دوڑ میں حصہ لینے والوں کے رسوم و اوہام کا مطالعہ ادب العوام کے تحت میں کیا جائے تو بہت دلچسپ واقعات معلوم ہوں گے۔ ادب العوام میں ایک بڑا عیب یہ ہے کہ سب لوگ اپنی قوم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور اس کے رسم و رواج کی تفسیر موجودہ زمانے کے رنگ کے مطابق کرتے ہیں۔

(۵) عام تاریخ تمدن۔ یہ ایک وسیع علم ہے جو علم الاقوام پر حاوی ہے، اس کی ترقی میں مدد دیتا ہے اور اس کی کارگزاری سے خود بھی مدد لیتا ہے۔ اشمت اور کاپرس نے جو وائنا کے ماہرین علم الاقوام کے سرگروہ ہیں عام تاریخ تمدن کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ ایک روداد ہے ذہن انسانی کے ارتقا اور مادّی تمدن کے اُن تمام مظاہر کے نشو و نما کی جو انسان کے ذہن نے پیدا کیے ہیں۔

واقعات کے جمع کرنے کا طریقہ

ابتدائی قوموں کے حالات معلوم کرنے کے دو ذریعے ہیں:۔

(الف) مہذب قوموں کی لکھی ہوئی کتابیں مثلاً اہل چین کے سوانح قدیم مصر کی خط تصویر کی تحریریں، وید، ارسطو کی تصانیف وغیرہ جن کی علمی قدر جیسا کہ ہم نے ایک پچھلے باب میں کہا ہے، بہت مختلف ہے۔ لیکن ان سے زمانے کا صحیح تعین کیا جا سکتا ہے کیونکہ عموماً ان میں واقعات

کے اسناد دیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر ہم قدیم مصر کے کتبوں میں افریقہ کے بونوں کے متعلق جو آج کل کونگو کے بعض جنگلوں میں پائے جاتے ہیں، یہ پڑھتے ہیں کہ جنوبی خطّے کی تحقیقی سیاحت کرنے والوں نے تعجب کے ساتھ اُن کا ذکر کیا ہے تو ہم بجا طور پر یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ اس زمانے میں بھی افریقہ کے بونے دُور و دراز جنگلوں میں چھپ کر اُسی طرح رہتے ہوں گے جیسے کہ آج کل رہتے ہیں۔ اگر ہم ایک خاص سنہ کے چینی سوانح میں میاؤ قوموں کے متعلق یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ وہ چینیوں سے بہت مختلف تھے تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ چینی تہذیب کا رنگ جو اُن پر اب چڑھ رہا ہے اس وقت تک نہیں چڑھا تھا۔

(ب) ابتدائی قوموں کے برتنے کی چیزوں اور رسم و رواج وغیرہ کا بلا واسطہ مشاہدہ۔ ظاہر ہے کہ علم الاقوام کی تحقیق کا اصلی طریقہ یہی ہے۔ مگر یہاں بھی اصلیت اور حقیقت کو پہچاننے کے لیے مناسب تنقید سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ہمارے مشاہدے کی موضوع دو قسم کی چیزیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو مادّی تہذیب کے بلا واسطہ معروضات، دوسرے بالواسطہ شہادتیں یعنی وہ بیانات، یادداشتیں، تصویریں، گراموفون کے رکارڈ وغیرہ جو علم الاقوام کے ماہروں یا عام لوگوں نے جمع کیے ہیں۔ بلا واسطہ شہادتوں کی اصلیت کو جانچنے کے مختلف طریقے ہیں۔ ایک تو یہ کہ جن معروضات کا مشاہدہ کیا گیا ہے وہ سب کے سب اُن چیزوں کے بنے ہوئے ہونے چاہییں جو اُس ملک اور قوم میں جس کی طرف وہ منسوب ہیں، واقعی پائی جاتی ہوں۔ ان کی بناوٹ، کاریگری اور "روح" ایسی ہونی چاہیے جو اس

قوم کے عام طرز زندگی سے مناسبت رکھتی ہو۔

بالواسطہ شہادتوں یعنی دوسروں کے بیانات کے متعلق اس بات کی اچھی طرح چھان بین کرنے کی ضرورت ہی کہ یہ معلومات کیونکر فراہم کی گئی آیا بیان کرنے والے نے اپنی کوشش سے فراہم کی ہی یا دوسروں پر مثلاً ترجمان وغیرہ پر بھروسہ کیا ہی۔

پھر یہ بھی دیکھنے کی ضرورت ہی کہ بیان کرنے والے کا رویہ اس معلومات کے بارے میں کیا ہی۔ اگر اُسے ان باتوں کے کہنے سے کسی مادّی فائدے کا امکان ہو یا کسی وجہ سے ایک خاص نظریے کو ثابت کرنے کی فکر ہو تو اس کا بیان شبہے کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ ظاہر ہی اس کے یہ معنی نہیں کہ ہمیں کسی ایسے بیان پر سرے سے اعتبار ہی نہ کرنا چاہیے جس سے وہ نظریہ ثابت ہوتا ہو جسے بیان کرنے والا ثابت کرنا چاہتا ہی بلکہ صرف اس بات کی طرف توجہ دلانا ہی کہ ہمیں کس قسم کی احتیاط کی ضرورت ہی۔

واقعات و معلومات کو جمع کرنے کے بعد دوسرا قدم ان کی تعبیر ہی۔ اس واقعہ کا علم کہ آسٹریلیا کے کُرنائی یا آرنٹا قبائل نہ معلوم کس غرض کے لیے لکڑی کے چوکور ٹکڑے استعمال کرتے ہیں، کسی قسم کی علمی تحقیقات کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ لیکن جب اُسی کے ساتھ ہمیں یہ معلوم ہوتا ہی کہ وہ بعض تقریبوں کے موقع پر ان لکڑی کے ٹکڑوں کو ایک رسّی میں باندھ کر چکر دیتے ہیں اور اس سے بادل کی گرج کی سی آواز نکلتی ہی تو ہمیں اس سے زیادہ دلچسپی پیدا ہو جاتی ہی۔ پھر جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس سیدھے سادے طریقے سے آواز

پیدا کرنا دنیا کی مختلف قوموں میں عام ہی تو اس واقعہ کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہی، خصوصاً جب ہمیں اس کا علم ہو کہ یہ آواز کسی دیوتا کی طرف یا بزرگوں کی روحوں کی طرف منسوب کی جاتی ہی۔ یہاں ہمارے سامنے علم الاقوام کی دو مختلف تعبیریں ہیں:۔

(الف) مقامی تعبیر۔ یعنی اس بات کا مشاہدہ کرنا کہ اس اوزار سے کس طرح کام لیا جاتا ہی اور اس کے ساتھ کیا کیا خیالات اور تصورات وابستہ ہیں۔

(ب) تقابلی تعبیر۔ یعنی نہ صرف خود اس آواز کی بلکہ اُن خیالات کی بھی جو اس کے ساتھ وابستہ ہیں، حقیقت اور اہمیت کو سمجھنا۔ یہ بات ظاہر ہی اور اس کے لیے کسی مزید تشریح کی ضرورت نہیں۔ اس واقعہ کی تہ تک پہنچنے کے لیے صرف مقامی تعبیر کافی نہیں ہی بلکہ اسی قسم کی اور رسموں سے جو دنیا کے دوسرے حصوں میں رائج ہیں اس کا مقابلہ کرنے کی ضرورت ہی۔ اگر سب نہیں تو کم از کم اکثر صورتوں میں یہ بات صحیح ہی۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہی کہ علم الاقوام کے عالمگیر مشاہدات کتنی بڑی قدر و قیمت رکھتے ہیں، اور تاریخ تمدن کی تحقیقات کو جو فائدہ ان سے پہنچتا ہی وہ کسی اور طریقے سے نہیں پہنچ سکتا۔

تقابلی تعبیر کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ ایک تو اُن تہذیبوں کا مقابلہ جن میں بُعدِ مکانی ہی، دوسرے اُن کا جن میں بُعدِ زمانی ہو۔ ان دونوں سے ہمیں ان انفرادی تہذیبی خصوصیات کی حقیقی اہمیت سمجھنے میں مدد ملتی ہی جو کسی دوسرے طریقے سے نہیں سمجھی جا سکتی تھیں۔ اس کی معمولی سی مثال یہ ہی۔ ہماری سمجھ میں ہرگز نہ آتا کہ وہ مخروطی شکل

کی چیزیں جو موہنجو دارو کے محل وقوع میں پائی گئی ہیں کیا ہیں، اگر ہم ان کا مقابلہ اسی شکل کے پتھروں سے نہ کرتے جو آج کل ہندستان میں لنگ کے طور پر استعمال ہوتے ہیں۔ یہاں قبل تاریخی زمانے کی ایک چیز کی توجیہہ موجودہ زمانے سے مقابلہ کرنے کے ذریعہ کی گئی۔ اسی طرح جب ہمیں یہ معلوم ہوگیا کہ افریقہ میں مردوں کی مذہبی جماعتیں بنانے کی تہ میں عورتوں کو مغلوب رکھنے کا جذبہ کام کر رہا تھا تو ایشیا، ملانیشیا، پولینیشیا اور امریکا کی اسی قسم کی جماعتوں کی تعبیر اور توجیہہ میں کوئی مشکل نہیں رہی، ورنہ ان ملکوں میں اس کا پتہ چلانا اتنا آسان نہ تھا جتنا افریقہ میں۔ ؎

ترتیب

علم الاقوام کی تحقیقات کا صرف یہی مقصد نہیں کہ منفرد واقعات کا علم حاصل ہو جائے بلکہ اس کا ایک بلند تر مقصد بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ مختلف تہذیبی عناصر کے باہمی ربط کو سمجھ کر جماعتوں کا تصور اجسام نامیہ کی حیثیت سے کیا جائے۔ اس ترتیب کے تین مدارج ہیں:

۱۔ وہ معیار قائم کرنا جن کے مطابق یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ مختلف قوموں کے فلاں فلاں تہذیبی عناصر میں باہم کوئی تعلق ہے یا نہیں۔

۲۔ تہذیبی دائرے اور اُن کا بیان۔ ہم اس تہذیب کو جو ایک جسم نامی کی حیثیت سے اپنی جداگانہ خصوصیات رکھتی ہو اور جس کے متعلق ہم بجا طور پر یہ فرض کر سکیں کہ اس کا آغاز ایک خاص

جغرافی علاقے میں ہوا، تہذیبی دائرہ کہتے ہیں۔ چار بنیادی تہذیبی دائرے جنھوں نے بظاہر نوع انسانی کی ابتدائی تاریخ کی تشکیل کی ہی، آگے چل کر تمام روئے زمین پر پھیل گئے۔ ان میں باہم آمیزش ہوتی رہی اور ایک کا دوسرے پر بہت کچھ اثر پڑتا رہا۔ علم الاقوام کا ایک اہم مقصد یہ معلوم کرنا ہی کہ کون سا تہذیبی عنصر کس تہذیبی دائرے سے تعلق رکھتا ہی؟ اور کون سی قوم یا قبیلہ کس تہذیبی دائرے یا کن تہذیبی دائروں سے متاثر ہوا ہی؟

۳۔ علم الاقوام کے مظاہر میں علّت و معلول کا سوال۔ یہ غالباً علم الاقوام کا سب سے زیادہ غیر یقینی لیکن اسی کے ساتھ سب سے زیادہ دلچسپ حصہ ہی۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہی رُوئے زمین پر کوئی قوم، خواہ وہ کتنی ہی ابتدائی کیوں نہ ہو، آگ کے استعمال سے ناواقف نہیں تھی حالانکہ یہ خاصی مشکل چیز اور ذہن کا ایک بڑا کارنامہ ہی۔ مگر مٹی کے برتن بنانا اور پانی کو صفائی کے لیے استعمال کرنا بہت بعد میں دریافت کیا گیا۔ آخر اس کی کیا وجہ ہی؟ تیرکمان بنانا ایک پیچیدہ کام ہی لیکن جہاں تک پتہ چلتا ہی انسان اسے ابتدا سے جانتے ہیں اور یہ سب سے ابتدائی تہذیب کا ایک مشترک عنصر ہی۔ لیکن نیزہ اور گُرز جو مقابلتاً بہت سادہ شکل کا ہی اور جس کا بنانا اور استعمال کرنا زیادہ آسان ہی صرف ترقی یافتہ قوموں میں پایا جاتا ہی۔ اس کا کیا سبب ہی؟ یہ کیا بات ہی کہ بعض قوموں میں حکومت پدری کا رواج تھا اور بعض میں حکومت مادری کا؟ کیا اس امر کی کوئی معقول توجیہہ ہو سکتی ہی کہ مختلف

انسان زندگی کے بارے میں مختلف نظریات رکھتے ہیں ؟ ان میں سے کون سا نظریہ ان سب مظاہر کی قرینِ قیاس تاویل کرسکتا ہو جو بظاہر کسی "طبیعی" قانون کے منطقی یا کُلّی قواعد کے تحت میں نہیں آتے ؟ ترتیب کے ان تینوں مدارج میں وائینا کے ماہرین علم الاقوام نے جو طریقہ استعمال کیا ہو وہ خاصا پیچیدہ ہو اور اس میں بہت سے جزوی مسائل کی بحث آگئی ہو، جنھیں غیر اہل فن نہیں سمجھ سکتے۔ چونکہ علم الاقوام کی یہ مختصر کتاب غیر اہل فن کے لیے لکھی گئی ہو، اس لیے یہاں اُن جزئیات کا ذکر کرنا، جن کے سمجھنے کے لیے واقعات سے اچھی طرح واقف ہونا ضروری ہو، سخت غلطی ہوگی۔ اس لیے ہم ترتیب کے ان تینوں مدارج کا ایک عام فہم خاکہ پیش کرنے پر اکتفا کریں گے جو اصل موضوع بحث کے لیے تمہید کا کام دے گا۔

۱۔ معیار

معیار دو طرح کے ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ جن سے دنیا کے مختلف حصوں میں، دوسرے وہ جن سے مختلف زبانوں میں یکساں تہذیبی مظاہر کا مشترک الاصل ہونا ظاہر ہو، اس لیے مشترک الاصل کے معیار کی دو قسمیں قرار دی گئی ہیں۔

(الف) معیار مکانی اور (ب) معیار زمانی

(الف) معیار مکانی۔ محض یہ بات کہ دنیا کے مختلف حصوں میں یکساں تہذیبی خصوصیات پائی جاتی ہیں، یہ فرض کرنے کے لیے

کافی نہیں کہ اُن کی اصل مشترک ہے۔ اس بات کا قطعی ثبوت ہونا چاہیے کہ یہ چیزیں ہر جگہ جداگانہ طور پر ایجاد نہیں ہوئیں۔ درخت کی شاخوں، پتیوں اور بانس کے ٹکڑوں سے جھونپڑی بنانا سب انسانوں میں عام ہے، اور یہ ضروری نہیں کہ یہ رواج ایک مشترک تہذیب سے تعلق رکھتا ہو۔ لیکن جب یہ جھونپڑیاں ایک خاص شکل کی مثلاً مستطیل یا مخروطی یا ٹوکری کے طرز کی ہوں تو وہ ایک مشترک اصل کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ اس لیے کہ ان میں سے کوئی شکل بھی ان چیزوں کے لحاظ سے جن سے کہ یہ جھونپڑیاں بنی ہیں یا اس مقصد کے لحاظ سے جس کے لیے یہ جھونپڑیاں بنائی گئی ہیں، ضرور نہیں ہے۔ لہذا یہ قرین قیاس ہے کہ جتنی جھونپڑیاں مستطیل شکل کی ہیں وہ سب ایک ہی نمونے پر مبنی ہیں، اور یہ نمونہ اس جگہ استعمال ہوتا تھا جو مستطیل شکل میں رہنے والی کل ابتدائی قوموں کا مشترک وطن تھا۔ ہر چند کہ ان جھونپڑیوں کا ایک مشترک اصل سے تعلق رکھنا قرین قیاس ہے مگر ہم اسے قطعی ثبوت نہیں کہہ سکتے۔ البتہ جب ہم یہ دیکھیں کہ بہت مقامات پر مستطیل جھونپڑیوں کے چاروں شہتیر ایک خاص طریقے سے جڑے ہوئے ہیں اور اُن پر آرائش کے لیے ایک خاص قسم کی ہندسی شکلیں بنی ہوئی ہیں جو نہ مسالے کے لحاظ سے ضروری ہیں اور نہ مقصد کے لحاظ سے، تب ہمیں یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ سب مستطیل جھونپڑیاں ایک ہی ابتدائی نمونے سے لی گئی ہیں جو ان سب میں مشترک ہے۔

وہ کیا چیز ہے جو سیدھی سادی مستطیل جھونپڑیوں کے باہمی تعلق

کو اس تعلق سے ممیز کرتی ہے جو دستکاری اور صناعی کی بعض خصوصیات رکھنے والی جھونپڑیوں میں پایا جاتا ہے۔ یہ تعلق کی وہ خاص نوعیت ہے جو نہ جھونپڑی کے مسالے کے لحاظ سے ضروری ہے اور نہ اس کے مقصد کے۔ یہ معیار جو مختلف تہذیبی مظاہر کی مشترک اصل یا کم سے کم ان میں ایک تاریخی تعلق ظاہر کرتا ہے "معیار کیفیت" کہلاتا ہے۔ اس معیار کو سب سے پہلے فریدرش راتسل نے اپنے مشاہدات میں استعمال کیا جیسا کہ ہم پچھلے باب میں علم الاقوام کی تاریخ کے سلسلے میں کہہ چکے ہیں۔

جب ہم اس قسم کے متعدد مشترک مظاہر پاتے ہیں تو ہم یہ کہتے ہیں کہ نوعیتِ اشتراک کی تائید مقدارِ اشتراک سے ہوتی ہے۔ یہ دوسرا معیار "معیار کمیت" کہلاتا ہے۔

اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک خاص قسم کی قوموں میں جن میں حکومت مادری کا رواج ہے مستطیل جھونپڑیاں، زراعت کا ایک مخصوص طریقہ اور دُہرے دفن کی رسم پائی جاتی ہے تو ہمیں معیار کمیت کی رُو سے یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ سب تہذیبی مظاہر ایک ہی جگہ (کم و بیش) ایک ہی زمانے میں اور ایک ہی دائرے میں وجود میں آئے تھے۔

غرض کیفیت اور کمیت کے کئی ایک معیاروں کا اکھٹا پایا جانا ہمیں تہذیبی دائروں کے تعین سے قریب تر کر دیتا ہے۔ لیکن یہ بجائے خود اُن کے تعین کے لیے کافی نہیں ہے، جیسا کہ ہم اس باب کے اگلے پیراگراف میں بتائیں گے۔

(ب) معیار زمانی:۔ مندرجہ بالا مثالوں میں ہم نے تہذیبی

مظاہر کے باہمی ربط سے بحث کی ہے۔ مگر ابھی تک ترتیب زمانی کا کوئی ذکر نہیں آیا ہے حالانکہ علم الاقوام کے تاریخی پہلو میں لازمی طور پر "مقدم اور موخر" علت و معلول غرض زمانی ترتیب پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے، اور اب ہمیں اس مسئلہ پر نظر ڈالنی ہے۔ اس کے حل کرنے میں تین طرح کے معیار زمانی سے کام لیا جاتا ہے:-

۱۔ جغرافی موقع۔ اگر ہمیں کوئی خاص تہذیب دنیا کے کسی دور افتادہ حصہ میں نظر آئے تو ہم یہ قیاس کر سکتے ہیں کہ یہ تہذیب بہت قدیم ہوگی۔ اور اگر ہم مختلف دور اُفتادہ خِطّوں میں ایک ہی قسم کی تہذیب پاتے ہیں اور دوسرے حالات بھی اس نظریہ کے موافق ہیں تو ہم اس نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں کہ یہ تہذیبیں ایک دوسرے سے تعلق رکھتی ہیں مثلاً ملاکا کے جنگلوں میں سمانگ قوم کی تہذیب، کانگو کے جنگلوں کے پست قد باشندوں کی تہذیب، جنوب مشرقی آسٹریلیا کے اصلی باشندوں، جزیرۂ فائرلینڈ کے رہنے والوں اور بحر منجمد شمالی کی اسکیمو قوم کی تہذیبیں نہ صرف کیفیت اور کمیت کے معیاروں کے لحاظ سے آپس میں حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں، بلکہ یہ سب کی سب ربع مسکون کے دور اُفتادہ خِطّوں میں واقع ہیں جن کو سوائے اُن لوگوں کے جنھوں نے بھاگ کر پناہ لی ہو اور کوئی پسند نہ کرتا۔ یہ مثال ہے معیار زمانی کی جو جغرافی موقع پر مبنی ہے اور جس سے ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ تہذیب جو دنیا کے دور اُفتادہ حصوں میں زمانے کی دستبرد سے اب تک محفوظ رہی، یقیناً بہت

قدیم ہوگی۔

۲۔ اضافی جغرافی موقع :۔ اگر دو تہذیبیں یا یوں کہیے کہ دو قومیں جو مختلف تہذیب رکھتی ہیں، مختلف زمانوں میں نقل مکان کر کے ایک ہی جگہ پہنچ جائیں وہ ایک دوسرے پر ایک خاص طریقے سے اثر ڈالیں گی۔ ممکن ہے کہ ان کے درمیان سارے ملک میں اتصال نہ واقع ہو بلکہ کسی حصے میں اتصال ہو، کہیں اُن میں سے ایک دوسرے پر چھا جائے اور کہیں دونوں الگ الگ رہیں۔ ان حصوں کی تہذیبی حالت میں جو باریک فرق نظر آتا ہے اس سے ہم یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ ان دونوں تہذیبوں میں سے کون زیادہ پرانی ہے۔

۳۔ معیار مقدمات لازمی :۔ یہ ایک سیدھا سادہ منطقی معیار ہے اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ کسی ملک میں کوئی مرکب تہذیبی مظہر اصلی نہیں کہا جا سکتا جب تک کہ اس کے رہنے والے قدیم زمانے میں ان اجزا سے واقف نہ رہے ہوں گے جن سے یہ مرکب بنا ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ دیکھیں کہ کوئی قوم سنگ تراشی کے پیچیدہ طرز کو کام میں لاتی ہے تو ہم یہ فرض کر سکتے ہیں کہ اس سے پہلے اس قوم نے دھات کے اوزار یا تو خود ایجاد کیے ہوں گے یا کسی دوسری قوم سے لیے ہوں گے۔ غرض ہم کسی تہذیبی مظہر کو ایک قوم میں اس وقت تک اصلی نہیں سمجھ سکتے جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ قوم پہلے سے ان عناصر سے جو اس مظہر کے لازمی مقدمات ہیں، واقف تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات مادّی اشیا اور ذہنی یا مذہبی تصورات دونوں پر صادق آتی ہے۔ مثلاً اگر ہم یہ دیکھیں کہ ایک قوم جادوگروں، شیطانی

ناچ والوں یا کاہنوں اور شاہینی پجاریوں وغیرہ کی قائل ہی تو ہمیں یاتو یہ سمجھنا چاہیے کہ اُس نے ان سب چیزوں کو کسی دوسری تہذیب سے بجنسہٖ لے لیا ہی یا پھر یہ فرض کرنا چاہیے کہ اُس قوم کا سماجی نظام مختلف طبقوں پر مشتمل تھا جن میں سے ایک پجاریوں کا طبقہ بھی تھا اور وہ قوم ساحری کے پیچیدہ تصورات رکھتی تھی اور یہ دونوں چیزیں ابتدائی یا اصلی تہذیب میں نہیں پائی جاتیں۔

اسے ایک ضابطے کی شکل میں لانے کے لیے ہم کہہ سکتے ہیں اگر ایک تہذیبی عنصر کے وجود کے لیے دوسرے تہذیبی عناصر ب، ج، د لازمی مقدمات کی حیثیت سے ضروری ہیں تو ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ (ا) اُن کے بعد ظہور میں آیا بشرطیکہ وہ کسی دوسری تہذیب سے بجنسہٖ اخذ نہ کر لیا گیا ہو۔

تہذیبی دائرے

ان کے ذریعے سے ہم اس کا پتہ چلاتے ہیں کہ متعدد تہذیبی عناصر ایک ہی اصل سے نکلے ہیں یا کم سے کم ایک دوسرے سے تعلق رکھتے ہیں۔

کیا محض ان عناصر کا ایک مجموعہ تہذیبی دائرہ بن جاتا ہی؟ ہرگز نہیں۔ اگرچہ تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے مختلف عناصر کا باہمی علاقہ معلوم کرنے کا اصل مقصد ہی یہ ہی کہ تہذیبی دائروں کا تعین اور ان کا تاریخی مطالعہ کیا جائے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم تہذیبی عناصر کے ہر مجموعے کو جس میں باہمی تعلق ثابت ہو جائے

اصطلاحی معنی میں "تہذیبی دائرے" کہہ سکتے ہیں۔

انسانی معاشرے کا ایک تہذیبی دائرہ بننے کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔

(۱) منفرد تہذیبی عناصر کے مجموعے میں ترکیب اور وحدت کا پایا جانا۔

(۲) تہذیب کے اُس مرکب کا جس میں یہ وحدت پائی جاتی ہو دنیا کے مختلف حصوں میں ایک ہی شکل میں موجود ہونا۔

(۳) معاشری، مذہبی اور صنعتی عناصر کا ہم آہنگ ہونا اور مل کر ایک تہذیبی واحدہ بنانا۔

اگر ایک تہذیبی واحدہ دنیا کے مختلف حصوں میں پایا جائے تو ہم صحیح اصطلاحی معنی میں اسے تہذیبی دائرہ کہیں گے بشرطیکہ وہ تہذیبی عناصر جن کا یہاں ذکر ہو آب و ہوا، محلِ وقوع یا گردو پیش کے دوسرے حالات کا لازمی نتیجہ نہ ہوں۔

علّت و معلول

(علم الاقوام میں)

چنانچہ ہماری تحقیقات کی ترتیب یہ ہونی چاہیے:۔

(۱) اس بات کی تحقیق کہ کون سے تہذیبی مرکبات دنیا کے کن کن حصوں میں پائے جاتے ہیں۔

(۲) زمانے کے لحاظ سے دیکھ کر یہ فیصلہ کرنا کہ کون سے تہذیبی عناصر یا تہذیبی خصوصیات مقدّم ہیں اور کون موخّر۔

(۳) اُن علّتوں کی تحلیل کرنا جن سے تہذیب و تمدّن میں مختلف تغیّرات پیدا ہوتے ہیں جو اکثر غیر منطقی ہوا کرتے ہیں۔

اس موقع پر یہ بے جا نہ ہوگا کہ ہم ایک رائے پہلے سے ظاہر کر دیں جو ہمیں انسانی تہذیب کی ہر منزل کا ذکر کرتے ہوئے ظاہر کرنی پڑے گی، اس سے رجائیت پسندوں کو تعجب ہوگا اور ان سب لوگوں کو جو نوع انسانی کی مسلسل ترقی کے قائل ہیں سخت مایوسی ہوگی۔ انسانی معاشروں میں جو تغیرات رُونما ہوتے ہیں وہ شاذ و نادر ہی اُن کی حالت کو بہتر بناتے ہیں، اکثر صورتوں میں اِن سے نہ تو عقلی نقطۂ نظر سے زندگی کی اصلاح ہوتی ہے اور نہ مذہبی نقطہ نظر سے اُس میں سادگی پیدا ہوتی ہے بلکہ پیچیدگی بڑھ جاتی ہے اور ہم آہنگی کم ہوجاتی ہے۔ یہ بات خواہ بنی نوع انسان کے ہمدردوں کے لیے کتنی ہی دل شکن کیوں نہ ہو تہذیبی تغیرات کی توجیہہ میں ہمیشہ پیش نظر رہنی چاہیے اس لیے کہ ہمارے سائنس داں جو ہر چیز کو عقلی اور معروضی نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں ہر تغیر کا کوئی ایسا سبب ڈھونڈتے ہیں جو اصول عقل کے مطابق ہو اور حفظان صحت، فلاح عامہ یا کسی اور مقصد کے لحاظ سے مفید ہو لیکن ابتدائی قوموں اور "متمدن" قوموں کی تاریخ کا مطالعہ ہمیں یہ بتاتا ہے کہ واقعات کی یہ توجیہہ بہت کم ثابت ہوتی ہے۔ ہم اگلے باب میں جس میں ابتدائی تہذیبوں کا ذکر ہے یہ دیکھیں گے کہ نوع انسانی کا آغاز معاشرت، مذہب، حقیقی اخلاق، شخصی آزادی اور قدر و منزلت کے لحاظ سے بہت شاندار تھا۔ آج انسان نے خدا کی ان نعمتوں کی کیسی مٹی خراب کی ہے! یہاں انسانی زندگی کی

اُس بھیانک تصویر کو دکھانے کی ضرورت نہیں جس کا عکس ہمارے زمانے کی ہر چھوٹی سے چھوٹی چیز میں نظر آتا ہے۔

ہماری زندگی میں ہر اعتبار سے تنزل ہو رہا ہے سوا ایک چیز کے اور وہ مادّی دولت اور صنعتی علم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نوعِ انسانی کو آج کرہ ارض کی طبیعی قوتوں پر جو قدرت حاصل ہے قطع مسافت میں جس قدر آسانی ہوتی ہے بیماریوں کا خطرہ جتنا کم ہو گیا ہے پہلے کبھی نہ تھا۔ پچھلے تین قرنوں میں انسانوں کی تعداد دُگنی ہو گئی ہے اور قدرت کے بہت سے اسرار منکشف ہو گئے ہیں اور انسان ان سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔ مگر آخر ان سب چیزوں کا مقصد کیا ہے؟ کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت رکھتا ہے کہ مجموعی طور پر نوعِ انسانی کی راحت میں اضافہ ہوا ہے؟

ان مشاہدات سے ہم کس نتیجے پر پہنچتے ہیں؟

اس نتیجے پر کہ انسانی معاشرے میں جو تغیرات ہوتے ہیں وہ بہت کم عقل و حکمت یعنی خبر و بصیرت پر مبنی ہوتے ہیں

پھر آخر تغیرات کے اس غیر منقطع سلسلے کے اسباب کیا ہیں؟
علم الاقوام کی تحقیقات سے دو قسم کے عوامل کا پتہ چلا ہے جن سے یہ گوناگوں تبدیلیاں ظہور میں آتی ہیں:۔

(الف) خارجی

(ب) داخلی

ان میں خارجی عوامل کہیں زیادہ ہیں۔ رہے داخلی عوامل سو ان کا اثر بھی کچھ ضروری نہیں کہ انسانی معاشرے کے لیے ہمیشہ مفید ہو۔

(ا) خارجی اثرات جن سے تہذیب و تمدن میں تغیرات واقع ہوتے ہیں بہت سے ہیں اور ہم کئی بار ان کی طرف اشارہ کرچکے ہیں۔ یہ اثرات آٹھ قسم کے ہیں اور انسانوں کے میل جول کی مندرجۂ ذیل صورتوں میں ظاہر ہوتے ہیں:- پوری قوتوں کا نقل مکان، تجارت، مذہبی تبلیغ، نو آبادیاں قائم کرنا (جو اکثر صورتوں میں نقل مکان کی حد تک نہیں پہنچتا) محکوم قوم کے لوگوں کو زبردستی ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچانا (عموماً اس غرض سے کہ سستے مزدور میسر آسکیں) عورتوں کو پکڑ کر لے جانا، بردہ فروشی، اور سب سے زیادہ مفتوح قوموں کا فاتحوں کے رسوم و روایات اور خیالات کی تقلید کرنا۔

یہ آخری صورت خاص طور پر قابل لحاظ ہے۔ براعظم یوریشیا (یورپ - ایشیا) کی پوری تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جب وسط ایشیا کے سرد اور بنجر خطے کے باشندوں نے جنوب کے زرخیز اور پُرامن میدانوں پر حملے کیے تو اکثر صورتوں میں وسط ایشیا کے مذہبی اور معاشرتی خیالات - وضع و لباس، صنعت و حرفت وغیرہ کو جنوبی ملکوں نے اختیار کرلیا جہاں یہ چیزیں بیکار ہی نہیں بلکہ مضر ثابت ہوئیں۔ جو شخص ہندستان کے لباس کی وضعوں کا مطالعہ کرے گا اسے ان افسوسناک غیرملکی اثرات کی بہت سی عملی مثالیں مل جائیں گی۔

(ب) داخلی اثرات - انسانی تاریخ میں داخلی تغیرات کے اسباب کا پتہ چلانا اس سے کہیں زیادہ مشکل ہے جتنا خارجی تغیرات کے اسباب کا خصوصاً اُس معاشرے میں جو لکھنے پڑھنے سے واقف نہ ہو۔ اگر قرآن شریف موجود نہ ہوتا اور آنحضرتؐ کے زمانے میں عرب لکھنا

نہ دیکھ لیتے تو ہمارے لیے یہ معلوم کرنا مشکل ہوتا کہ اُن کے کون سے قوانین زمانہ جاہلیت سے چلے آتے تھے اور کون سے احکام قرآنی پر مبنی ہیں۔ بے پڑھی لکھی قوموں کی زندگی میں جو تغیرات ہوتے ہیں ان کے بارے میں یہ پتہ چلانا دشوار ہو کہ ان میں سے کن کے اسباب خارجی تھے اور کن کے داخلی خصوصاً اگر یہ تغیرات علمی تحقیق کے زمانے سے پہلے واقع ہوئے ہوں۔ داخلی تغیرات کے عوامل مختلف ہوتے ہیں۔ ان کی تحقیق اور تشریح کرنا اکثر صورتوں میں علم الاقوام سے زیادہ علم النفس سے تعلق رکھتا ہو۔ طبعی ماحول کے تغیرات مثلاً آب و ہوا کی تبدیلیوں، زلزلوں، کوہ آتش فشاں کے پھٹنے وغیرہ کا بھی بہت کچھ اثر پڑتا ہو۔ مگر ان سب سے زیادہ اہم یقیناً اشخاص کا اثر ہو جس کا اندازہ اب تک، کم سے کم ابتدائی قوموں کے معاملے میں بہت گھٹا کر کیا گیا ہو۔ عموماً علم الاقوام کی جدید تحقیقات سے[۵] اور خصوصاً اُس کی اُس تعبیر سے جو اِشمٹ اور کوپرس نے کی ہو[۶] یہ بات ثابت ہوگئی ہو کہ "ابتدائی معاشرہ کوئی یک رنگ اور بے لوچ نظام نہیں ہو جس پر افراد کی کوششوں کا کچھ اثر نہ پڑتا ہو بلکہ "ابتدائی قوموں" میں فرد کا اثر اس سے کہیں زیادہ ہوتا ہو جتنا "پوری مہذب قوموں" میں۔ اس میں شک نہیں کہ زندگی کے مادی تصور کی بدولت اب ہم ان معاشی اور جغرانی قوتوں کی اہمیت کا صحیح اندازہ کرنے لگے ہیں جو تاریخی واقعات کی تہ میں کارفرما ہیں اور جنھیں ہم پہلے محض افراد کی طرف منسوب کر دیا کرتے تھے۔ مگر اسی کے ساتھ تاریخ کی مادی تعبیر بھی اپنی طرف مبالغے

سے کام لیتی ہے اور فرد کی اہمیت کو، خصوصاً ابتدائی قوموں کی زندگی میں بہت خفیف کرکے دکھاتی ہے۔ ان غلطیوں کو بے تعصبانہ تحقیقات کے ذریعے سے دور کرنا بھی علم الاقوام کا ایک اہم فرض ہے۔

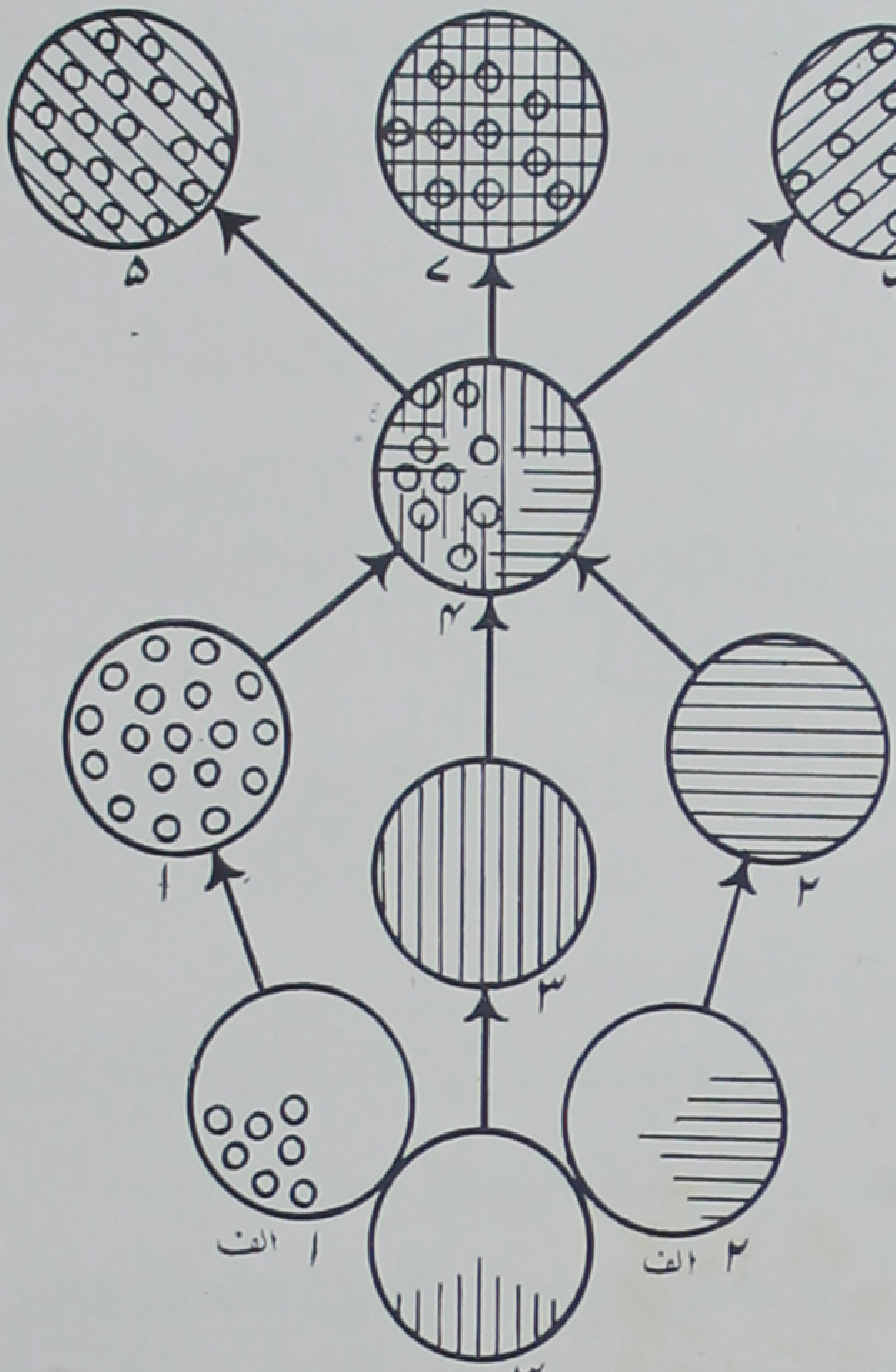
خاتمہ

علم الاقوام کے طریق تحقیق کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں:۔

(ا) جو اشیا علم الاقوام کی موضوع ہیں اور جو بیانات اس کے متعلق موجود ہیں ان کا تنقیدی مطالعہ۔

(ب) واقعات کی باضابطہ تعبیر کچھ تو مقام تحقیق کے مشاہدے کے ذریعے سے اور کچھ دوسری قوموں کے رسم ورواج اور مشاغل کے ساتھ مقابلہ کرکے۔

(ج) مختلف تہذیبی عناصر کی ترکیبوں، ان کی باہمی مشابہت اور مطابقت کو ربط دے کر بنیادی تہذیبوں کا ایک نظام مرتب کرنا۔ انھیں کو ہم "تہذیبی دائرے" کہتے ہیں۔ یہ بنیادی عالمگیر تہذیبیں اپنے افعال و وظائف کے لحاظ سے علیحدہ اور مستقل وجود رکھتی ہیں۔ یہاں ہمیں تہذیبی دائروں اور تہذیبی رقبوں میں فرق کرنا چاہیے۔ تہذیبی رقبوں کا تعین بھی افعال و وظائف کی بنا پر کیا جاتا ہے لیکن یہ محض مقامی حیثیت رکھتے ہیں۔ شمالی ہند کے میدان یا دریائے نیل کی وادی کو ہم ایک تہذیبی رقبہ کہہ سکتے ہیں لیکن خانہ بدوش گلہ بانوں کی پدری تہذیب اور پہلی زراعتی ریاستوں کی مادری تہذیب کو تہذیبی دائرے کہیں گے اس لیے کہ یہ مختلف



اس نقشے سے ظاہر ہوتا ہی کہ کس طرح اندرونی عوامل کے اثر سے چند تہذیبیں یا تہذیبی دائرے پیدا ہوئے [نمبر ۱ (الف)، ۲ (الف)، ۳ (الف)]
بیرونی عوامل یا مختلف تہذیبوں کے باہمی سابقے سے جو تبدیلیاں پیدا ہوئیں وہ نمبر ۱ ، ۲ ، ۳ ، میں دکھائی گئی ہیں ۔
نمبر ۴ میں ایک ایسے تہذیبی دائرے کا بننا دکھایا گیا ہی جس میں مختلف عناصر خلط ملط ہیں ۔

نمبر ۵، ۶، ۷، میں یہ دکھایا ہی کہ مختلف عناصر کے ہم آہنگی کے ساتھ ملنے سے مرکب تہذیبیں وجود میں آتی ہیں ۔ اگر انھوں نے ایک مستقل اور مستحکم حیثیت حاصل کر لی ہی اور ساری دنیا میں پھیل گئی ہیں تو انھیں مرکب تہذیبی دائروں کا درجہ
جاتا ہی

زمانوں میں مختلف طریقوں سے ساری دنیا میں پھیل گئے تھے۔ سب سے بڑا مسئلہ جسے علم الاقوام کی بنیاد سمجھنا چاہیے، یہ ہو کہ انسانی معاشرے میں تغیرات کن اسباب سے ہوئے، ہوتے ہیں اور ہوں گے؟

ان تغیرات کی دو بڑی قسمیں ہیں (الف) وہ تبدیلیاں جو خارجی اثرات سے اور (ب) وہ تبدیلیاں جو داخلی اثرات سے واقع ہوئیں۔ آخرالذکر میں افراد کا بہت بڑا حصہ ہوتا ہو خصوصاً ابتدائی معاشروں میں جس کی اہمیت کو تاریخ کے مادّی تصور اور انسانی معاشرت کی ارتقائی تعبیر نے اب تک بہت گھٹا کر دکھایا ہو۔

علم الاقوام کا مقصد یہ ہو کہ علمی اور تاریخی تحقیق کے ذریعے سے انسانوں کے رسم و رواج اور عقائد، روایات و اوہام، وضع و لباس فنون لطیفہ، صنعت و حرفت غرض کُل تہذیبی کارناموں کے آغاز اور نشو و نما کا پتہ چلائے۔ علم الاقوام کی معلومات کا ماخذ، بے پڑھی لکھی ابتدائی قوموں کی وہ خصوصیات ہیں جو اب تک باقی رہ گئی ہیں۔ واقعات کی غلط تعبیر سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہو کہ ضابطے اور نظام سے کام لیا جائے لیکن اسی کے ساتھ ہمیں اس حقیقت کو نہیں بھولنا چاہیے کہ ہماری تحقیق کے موضوع جیتے جاگتے انسان ہیں جن کے دل میں امید و یاس نفرت اور محبت کے جذبات اُسی طرح موج زن ہیں جیسے ہمارے دل میں۔

علم الاقوام کی تحقیقات سے معلوم ہوتا ہو کہ انسان کے ذہن نے عالم طبیعی پر قابو پانے میں حیرت انگیز ترقی کی ہو لیکن جہاں تک

رسم و رواج ، دستور اور روایات کا تعلق ہے خاک بھی ترقی نہیں کی بلکہ سچ پوچھیے تو نوع انسانی نے اعلیٰ ترین اقدار اور حقیقی راحت کو کھو کر غلط دستور ، بے کار اوہام اور مُضر اوضاع و اطوار اختیار کر لیے ہیں۔ یہ چیزیں جس جگہ پر پائی جاتی ہیں اُن کے لیے موزوں نہیں ہیں بلکہ کسی اور آب و ہوا ، کسی اور ملک کے لیے جو اس سے ہزار ہا میل کے فاصلے پر ہے۔

علم الاقوام کی تحقیقات جو بغیر کسی تعصب کے معروضی نقطۂ نظر سے کی جائے موجودہ زمانے کے انسانوں کو مفید سبق دے سکتی ہے۔ اس لیے ہماری یہ درخواست اور بھی زیادہ مناسب اور ضروری ہے کہ علم الاقوام کے مسائل کے بارے میں رائے دینے سے پہلے واقعات کی مکمل تحقیق ، باضابطہ اور معقول تعبیر اور ربط کی ضرورت ہے۔ غرض علم الاقوام میں طریق تحقیق کی اہمیت کو ہرگز کم نہیں سمجھنا چاہیے۔

چوتھا باب

اوّلین تہذیب

انسانی تہذیب و تمدن کے خاص خاص نمونوں کا ذکر تفصیل کے ساتھ کرنے سے پہلے ہمیں یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ ہم جو تصویر اس وقت پیش کر رہے ہیں وہ علم الاقوام کی موجودہ تحقیقات پر مبنی ہے۔ ہمیں امید ہے کہ مزید تحقیق سے ہمارا علم اور وسیع ہوگا اور اس تصویر میں ترمیم کرنی پڑے گی۔

جتنے نمونے انسانی تہذیب کے اب تک باقی ہیں ان میں سے یقیناً کوئی نہ کوئی سب سے قدیم اور اولین تہذیب سے زیادہ قریب ہوگا۔

سنہ ۱۹۰۴ء میں پروفیسر گریبنر نے یہ رائے ظاہر کی تھی کہ جزیرۂ ٹسمانیا میں جو ٹسمانی قوم آباد تھی اس کی تہذیب کو اولین تہذیب سمجھنا چاہیے۔ اس قوم کو انیسویں صدی کے آخر میں غیر ذمہ دار مہم جو لوگوں نے ختم کر دیا۔ ایک عورت جو بچ رہی تھی وہ سنہ ۱۸۷۶ء میں مرگئی۔ پھر بھی ٹسمانیوں کے تہذیب و تمدن کے اخبار و آثار اس قدر کافی موجود ہیں کہ ہم انھیں دیکھ کر کہہ سکتے ہیں کہ گو ان کی تہذیب ابتدائی تھی مگر جس معنی میں ہم نے اولین کا لفظ استعمال

کیا ہے یہ اولین تہذیب نہیں تھی۔ منجملہ اور قرائن کے اس کا ایک قرینہ یہ بھی ہے کہ اُن کے ہاں صیقل کیے ہوئے پتھر اوزار کی شکل میں تو نہیں مگر مورتوں کی شکل میں استعمال ہوتے تھے۔

اینڈریو لینگ کی اہم تحریروں نے تاریخ تمدن کے محققوں کو اس بات کی طرف توجہ کیا کہ کئی سادہ اور ابتدائی قبیلوں یعنی جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کے بونوں میں وحدانیت کا مذہبی تصور پایا جاتا ہے۔

پروفیسر ف۔ اشمٹ نے بونوں کے قبائل کے متعلق تاریخ تمدن کے نقطۂ نظر سے بحث کرتے ہوئے یہ کہا کہ یہی لوگ ہیں جنھوں نے نوع انسانی کی سب سے قدیم بلکہ اولین تہذیب کو قائم رکھا ہے۔ یہ سنہ ۱۹۱۰ء کا ذکر ہے۔

اس کے تھوڑے ہی دن بعد پروفیسر موصوف نے یہ تسلیم کیا کہ وہی تہذیبی خصوصیات جو بونوں میں موجود ہیں۔ کرۂ ارض کے آباد حصے کے شمالی سرے پر ایسکیمو قوم میں اور جنوبی سرے پر جزیرۂ فائرلینڈ اور جنوب مشرقی آسٹریلیا کے باشندوں میں بھی پائی جاتی ہیں۔

ان کے اس نظریے کی تائید نہ صرف اُن عمرانی، مذہبی، معاشی اور صنعتی خصوصیات سے ہوتی ہے جو ان دور افتادہ قوموں میں مشترک ہیں بلکہ خود اُن کے مقام سکونت سے بھی۔ یہ سب کے سب اُن خطوں میں آباد ہیں جو ربع مسکون کے آخری سرے پر واقع ہیں یا تو شمال بعید اور جنوب بعید کی انتہائی سرد آب و ہوا میں یا استوائی

علاقے کے گھنے اور مرطوب جنگلوں میں جہاں زندگی ہرگز خوشگوار نہیں کہی جاسکتی۔ ایک تو یہ بات، دوسرے ان کی تہذیب کی سادگی اور اُن کی جسمانی ساخت اس پر دلالت کرتی ہو کہ یہی اس "اولین تہذیب" کے آخری حامل ہیں جسے ان کے "چھوٹے بھائیوں" نے جو صنعت وحرفت میں اُن سے آگے، سیاست میں ان سے تیز، مگر اخلاق و ہمدردی میں ان سے کم تر ہیں، بے دردی سے کُچلا ہو۔

پادری اِشمٹ کے نظریے پر لوگوں نے بہت سختی سے اعتراض کیے ہیں۔ یہ اعتراض طریق تحقیق کے ناکمل ہونے کی بنا پر ہیں اور بجا ہیں۔ ہم آگے چل کر تفصیل کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ جو قومیں اس مفروضہ "اولین تہذیب" کی حامل ہیں وہ ایک خدا کو مانتی ہیں اور ان میں عموماً ایک مرد کی ایک ہی بیوی ہوتی ہو۔ پروفیسر اِشمٹ ذاتی طور پر رومن کیتھلک پادری اور راہب ہیں اس لیے ان کے متعلق یہ خیال کیا گیا کہ اگر اصولی مصلحت نہیں تو کم سے کم شخصی رجحان کی بنا پر انھوں نے یک زوجی خاندان اور وحدانیت کے عقیدے کو انسان کی فطرتِ اصلی کا تقاضا ثابت کیا ہو۔ گویا یہ ایک فطری الہام تھا جس میں پہلے سے اُس تعلیم کی جھلک نظر آتی ہو جو کیتھلک عقیدے کے مطابق حضرت عیسےٰ نے آگے چل کر دی۔

غرض طریق تحقیق کی شرائط کو مدنظر رکھتے ہوئے پادری صاحب کے نتائج کو کسی قدر شبہے کی نظر سے دیکھنا بے جا نہ تھا۔ لیکن آگے چل کر علم الاقوام کے مشاہدات اور ان کے تقابل سے موصوف کے نظریے کی خاص خاص باتوں کی اس حد تک تصدیق و تائید

ہوئی کہ یہ نظریہ نوع انسانی کی ابتدائی تاریخ کے موجودہ علمی تصور کا ایک نہایت اہم جزُ بن گیا۔

پہلے ہم ان خصوصیات کا ایک خاکہ پیش کرتے ہیں جو اولین تہذیب کی نشانیاں ہیں۔ اس کے بعد اس پر غور کریں گے کہ سطح ارض کے دور افتادہ حصّوں میں کون سی قومیں یا قوموں کے مجموعے اس اولین تہذیب کے حامل پائے جاتے ہیں۔

معیشت اور مادّی تمدن

اولین تہذیب میں مادی خوش حالی، صنعتی قابلیت اور عالم طبعی کی قوتوں پر قابو اور سب تہذیبوں سے کم پایا جاتا ہے۔ طبیعی ماحول کا پابند ہونا اس کی خصوصیات میں داخل ہے۔

غذا صرف قدرتی پیداوار کو جمع کرکے اور سیدھے سادے طریقے سے جانوروں کو شکار کرکے حاصل کی جاتی ہے۔ لوگوں میں اتنی دور اندیشی نہیں ہوتی کہ بہتات کے دنوں میں تنگی کے زمانے کے لیے ذخیرہ جمع کریں۔ وہ پانی میں کھانا پکانا بھی نہیں جانتے اس لیے کہ مٹی کے برتن بنانے کی منزل انسانی تہذیب کی نشوونما میں آگے چل کر آتی ہے۔ لیکن اس کے بجائے انھوں نے ایک بڑی اچھی ترکیب نکالی ہے کہ کھانے کی چیزوں کو سبز پتوں میں لپیٹ کر بھون لیتے ہیں جن میں پانی بہت بڑی مقدار میں موجود ہوتا ہے۔ اصلی تہذیب کی حامل قومیں جو استوائی خطے کے جنگلوں میں رہتی ہیں شہد جمع کرنے میں خاص مہارت رکھتی ہیں۔ وہاں ایک قسم کے

ڈبے دیکھے گئے ہیں جو بانس سے بنتے ہیں اور جن میں گوشت شہد کے اندر رکھا جاتا ہی۔

ان کی معمولی غذا کے جمع کرنے کا اوزار نوکدار لکڑی ہی جس سے عموماً عورتیں زمین سے جڑیں کھود کر نکالتی ہیں۔ نہایت ہی سادہ قسم کے تیر کمان سے چھوٹے جانور خصوصاً چڑیاں، گلہریاں، خرگوش وغیرہ شکار کیے جاتے ہیں اور زیادہ تر انھیں کا گوشت کھایا جاتا ہی۔ سادہ قسم کے بھالے اور گرز بھی کہیں کہیں استعمال ہوتے ہیں لیکن انھیں ان ہمسایہ قوموں سے ماخوذ سمجھنا چاہیے جو تہذیب و تمدن میں کچھ آگے ہیں۔ پتھر کے اوزار جو بالارادہ بنائے گئے ہوں اولین تہذیب کے ان بچے کھچے نمایندوں میں نہیں پائے جاتے۔ اس لیے یہ سوال اٹھایا گیا ہی کہ کیا قبل تاریخی عہد کے کُل پتھر کے اوزاروں کو یہی سمجھنا چاہیے کہ یہ اولین تہذیب کے دَور سے نہیں بلکہ بعد کے کسی دَور سے تعلق رکھتے ہیں۔ اصلی تہذیب کے زمانے میں اس کا تو پتہ چلتا ہی کہ بعض اوقات لکڑی، بانس اور ہڈی کے اوزار اور زیور گھونگھوں یا شاید لوہے کے ٹکڑوں کے ذریعے سے بنائے جاتے تھے مگر پتھر کی چیزیں بنانا اس وقت لوگوں کو نہیں آتا تھا۔ البتہ آگ کا استعمال اور سب انسانوں کی طرح اولین تہذیب کے حاملوں میں بھی پایا جاتا ہی حالانکہ آگ پیدا کرنے کے لیے زیادہ قابلیت اور قوت اختراع کی ضرورت ہی۔ ممکن ہی کہ سب سے پہلے "حل نما چقماق" Fire Ploughs. کے ذریعے سے پیدا کی گئی ہو جو آسٹریلیا میں یورپی سیاحوں کے ورود تک استعمال ہوتا تھا مگر آگ

کی ابتدا کے متعلق کوئی قطعی بات نہیں کہی جاسکتی ۔ یہ عجیب بات ہے کہ ایک طرف تو بالکل ابتدائی انسان مثلاً **Homo Peckinensis.** "قدیم پیکنی انسان" صریحاً آگ استعمال کرتے تھے اس لیے کہ ان کی ہڈیاں راکھ میں ملی ہوئی پائی جاتی ہیں اور دوسری طرف جزائر انڈمن کے باشندے اس وقت تک جب باہر کے لوگ وہاں پہنچے، آگ پیدا کرنے کا طریقہ نہیں جانتے تھے ۔ وہ آگ استعمال تو کرتے تھے مگر انھیں یہ اہتمام کرنا پڑتا تھا کہ وہ ہمیشہ چولھوں میں جلتی رہے اس لیے کہ اگر ایک بار بجھ جائے تو پھر نہیں جلا سکتے تھے ۔

اوّلین تہذیب میں مکان محض ایک سائبان کا نام تھا جو درخت کی کئی شاخوں کو زمین میں گاڑ کر اور ٹہنیوں سے جوڑ کر یا کبھی کبھی پتوں سے منڈھ کر بنایا جاتا تھا ۔ ممکن ہے کہ ٹوکری کی شکل کی جھونپڑیاں بھی اولین تہذیب کے دور میں پائی جاتی ہوں ۔ بہر حال یہ جھونپڑیاں زیادہ دن تک استعمال نہیں ہوتی تھیں اس لیے کہ ان کے رہنے والے ایک معینہ مدت کے بعد ایک جگہ سے دوسری جگہ چلے جایا کرتے تھے جب ایک پڑاؤ کے آس پاس غذا کے وسائل ختم ہو جائیں تو نئی جڑوں، پھل دار درختوں، اور شہد کے چھتوں کی تلاش میں اُسے چھوڑ کر کہیں اور جانا پڑتا تھا ۔ غاروں میں اولین تہذیب کے باشندے کبھی رہتے ہوئے نہیں دیکھے گئے ۔ اس میں شک نہیں کہ مختلف زمانوں میں دنیا کے بعض حصوں میں لوگ غاروں میں رہتے تھے لیکن یہ خیال بالکل غلط ہے کہ یہ "اولین انسان" تھے ۔ یہ بات آثار قدیمہ کی کھدائیوں سے بھی ظاہر ہوتی ہے ۔ جہاں کہیں غارنشینوں

کے آثار ملتے ہیں ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی تہذیب کسی قدر اونچے درجے کی تھی مثلاً عہد متاخر حجری کے غارنشین جو زیادہ تر وسط یورپ اور ایلپس کے علاقے میں آباد تھے شکار کے مخصوص ہتھیار رکھتے اور اسپین کے غارنشین جو شکار کے جانوروں مثلاً ہرن، ارنے بھینسے، گھوڑے وغیرہ کی نہایت عمدہ مطابق اصل تصویریں بنایا کرتے تھے۔

لباس کا استعمال قریب قریب سب قوموں میں، کم سے کم ان سب لوگوں میں جو اولین تہذیب کے حامل ہیں پایا جاتا ہے۔ گو ان کا لباس نہایت سادہ اور آب و ہوا کے مطابق ہوتا ہے۔ لباس کی تاریخ، تاریخ تمدن کا ایک نہایت دلچسپ اور اہم باب ہے۔ کسی اور چیز میں نوع انسانی نے عقل اور "فطری احساس کی ہم آہنگی" کی حدود سے اتنا زیادہ تجاوز نہیں کیا ہے جتنا لباس کے طرز اور وضع میں۔ لیکن اولین تہذیب کے حامل، اس وقت تک، جب تک کہ وہ غیر ملکیوں کے اثر سے بگڑنے نہیں پائے تھے، ایک معقول اور مناسب لباس کے استعمال پر قائم رہے۔ استوائی خطّے میں ان کا لباس پتوں یا ڈوریوں پر مشتمل ہوتا ہے جو مردوں اور عورتوں کے اندام نہانی کو ڈھکتا ہے اور اس کی حفاظت کرتا ہے۔ بحر منجمد شمالی کے علاقے میں سمور کے بڑے بڑے کوٹ باہر جاتے وقت پہنے جاتے ہیں۔ ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ لباس کا اصلی مقصد اندام نہانی کو کانٹوں شاخوں اور کیڑوں سے بچانا تھا یا ڈھکنا یا محض آرائش۔

معاشرتی تنظیم

اولین تہذیب کے معاشرتی تصور کی سب سے نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ خاندان یا قبیلے کا سردار نہ باپ تسلیم کیا جاتا ہے اور نہ ماں۔ نہ تو دولھا دلھن کے گھر جا کر رہتا ہے اور نہ دلھن دولھا کے گھر۔ بیٹے بیٹی میں یا ماں باپ میں محبت کے معاملے میں کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ اولاد ماں باپ دونوں سے ایک سی محبت کرتی ہے اور وہ بیٹے بیٹی سے یکساں شفقت سے پیش آتے ہیں۔ یہ ان سیدھے سادے لوگوں میں ایک نہایت عمدہ صفت ہے جس سے "ترقی یافتہ قوموں" کے اکثر والدین سبق لے سکتے ہیں۔

معاشرتی تنظیم کی بنیاد کنبوں پر قائم ہے جن میں عموماً دو چار خاندانوں سے زیادہ نہیں ہوتے۔ یہ لوگ اپنی خوشی سے مل جل کر رہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے مردوں اور عورتوں میں حقوق کی مساوی تقسیم میں آسانی ہوتی ہے۔

اگر ماں باپ کچھ تھوڑا بہت ترکہ چھوڑیں تو اس کی تقسیم لڑکوں اور لڑکیوں میں برابر ہوتی ہے۔ شادی کے بعد نہ دلھن دولھا کے والدین کے ساتھ رہنے کی پابند ہے اور نہ دولھا دلھن کے والدین کے ساتھ۔ اس لیے ہم بجا طور پر یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس تہذیب کی بنیاد مردوں اور عورتوں کی مساوات پر قائم ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اولین تہذیب کے جو حامل اب باقی رہ گئے ہیں ان میں ہم یا تو عورتوں کو مردوں پر غالب پاتے ہیں یا مردوں کو عورتوں پر

لیکن شاید اس کا سبب زیادہ تر دوسری قوموں کا اثر ہے جن میں یا تو مادری حکومت کا یا پدری حکومت کا رواج ہے۔ البتہ یہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ جب کوئی غیر معمولی خطرہ پیش آتا ہے تو کسی ایک شخص کو عموماً کسی بوڑھے مرد کو وہ حیثیت حاصل ہو جاتی ہے جو ان سے زیادہ کثیر التعداد اور دولت مند قبیلوں میں "سردار" کی ہوتی ہے۔

لیکن روز مرہ کی زندگی میں کسی ایک سردار یا بزرگ یا بزرگوں کی کسی جماعت کا حکم نہیں چلتا۔ اگرچہ اولاد اپنے ماں باپ سے بہت محبت اور ان کی اطاعت کرتی ہے لیکن والدین کو کوئی باضابطہ اختیارات حاصل نہیں ہوتے۔ عام طور پر وہ اپنے بچوں کو اچھے سبھاؤ، صفائی اور اخلاق سکھاتے ہیں۔ اور یہ بہت کم دیکھنے میں آتا ہے کہ ان کے بچے "مہذب" قوموں کے بچوں کی طرح نافرمانی یا شرارت کرتے ہوں یا روتے چلاّتے ہوں۔ حالانکہ والدین ان کی تربیت میں جسمانی سزا سے مطلق کام نہیں لیتے۔

گران کے ہاں تعلیم کا ایک اور اہم طریقہ بھی ہے جو ہمارے مدرسوں کی تعلیم سے ملتا جلتا ہے۔ یہ "محرمی" کی خاص رسمیں ہیں جو اولین تہذیب میں لڑکے اور لڑکیوں کو یکساں ادا کرنی پڑتی ہیں۔ یہ ایک واضح اور بلند اخلاقی ضابطے پر مبنی ہیں اور ان میں بچوں کو بڑے ضبط نفس سے کام لینا پڑتا ہے۔ انھیں ایک مدت تک بھوکا پیاسا رہنا اور اپنے جسم کو ایک خاص انداز سے رکھنا پڑتا ہے جو تکلیف دہ ہوتا ہے۔ یہ معمولی امتحان ہیں جو لڑکوں اور لڑکیوں کو پاس کرنے پڑتے ہیں اور ان کے بغیر وہ بالغ تسلیم نہیں کیے جاتے۔

یہ "محرمی" کی رسمیں علم الاقوام کے نقطہ نظر سے کئی لحاظ سے اہم ہیں۔ ہم اگلے بابوں میں یہ بتائیں گے کہ کس طرح ان تہذیبوں میں جو پدری حکومت پر مبنی ہیں لڑکیوں کے ساتھ اور ان میں جو مادری حکومت پر مبنی ہیں لڑکوں کے ساتھ غیر منصفانہ سلوک ہوتا ہے اور صرف ایک ہی صنف کی تعلیم پر زور دیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں ہم یہ بھی دکھائیں گے کہ "محرمی" کی رسموں کا جو سادہ اور شاندار تصور اولین تہذیب میں پایا جاتا ہے اس میں آگے چل کر کس قدر ڈھکوسلے اور اوہام شامل ہو گئے ہیں۔ ان رسموں کا بنیادی خیال زیادہ تر صداقت، اتحاد عمل بیماروں اور مصیبت زدوں کی امداد سے تعلق رکھتا ہے۔ عموماً مہماں نوازی کی اہمیت اور دروغ گوئی سے نفرت کرنے پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ لیکن محرمی کی رسموں کا جزو اعظم ہمیشہ مذہبی تعلیم ہوتی ہے جس کا ذکر ہم اس باب کے نکلتے حصے میں مذہب کی ذیل میں کریں گے۔ ان رسموں کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ صرف انھیں موقعوں پر بہت سے خاندانوں میں اتحاد عمل ہوتا ہے اور گویا ایک قبیلے کا احساس پیدا ہوتا ہے مگر عموماً ان رسموں کے ختم ہوتے ہی یہ احساس بھی غائب ہو جاتا ہے۔ ان رسموں کے سردھرے عموماً بوڑھے مرد ہوتے ہیں اگرچہ کبھی کبھی بوڑھی عورتوں کو بھی ان میں اچھا خاصا دخل ہوتا ہے۔

اولین تہذیب کے شادی کے قواعد میں بھی وہی سادگی اور طرفین کی بھلائی کا خیال پایا جاتا ہے۔ کنوارے لڑکوں اور لڑکیوں کی شخصی آزادی پر جس میں جنسی تعلقات بھی شامل ہیں، کچھ زیادہ پابندیاں

نہیں لگائی جاتیں اگرچہ عموماً یہ اپنے عشق و محبت کے معاملات میں احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ بہرحال ان چیزوں کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی۔ لیکن جب لڑکا لڑکی باہمی رضامندی سے شادی کرلیں اور ایک ہی گھر میں خواہ وہ دُلھن کا ہو یا دولھا کا، رہنے لگیں تو پھر یہ بہت بُرا سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک دوسرے کے سوا کسی اور سے محبت کریں۔ طلاق کا حق طرفین کو حاصل ہے۔

ان سب باتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اولین تہذیب میں پدری وراثت اور مادری وراثت دونوں طرح کے معاشرتی نظام کی بعض خصوصیات موجود ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کو جو شخصی آزادی گئی ہے وہ انسانی ارتقا کی اگلی منزل میں عموماً ان قوموں میں پائی جاتی ہے جن کے ہاں حکومت مادری کا رواج ہے۔ اسی طرح معاشرتی اور مذہبی امور میں مردوں کا اقتدار اور باپ کا اسی اولاد سے یقینی رشتہ آگے چل کر عموماً ان قوموں کی خصوصیات ہوتی ہیں جو حکومت پدری کی پابند ہیں۔

ظاہر ہے کہ اولین تہذیب کی سیدھی سادی معاشرت میں طبقے اور ذات کی تفریق نہیں ہوتی۔ آقا اور غلام، امرا اور عوام کا نام تک سننے میں نہیں آتا۔

اس سے زیادہ تعجب کی بات یہ ہے کہ اولین تہذیب کی حامل قوموں کا دامن قتل، چوری، زنا بالجبر وغیرہ سے پاک ہوتا ہے بشرطیکہ انھیں ہماری مہذب قوموں سے سابقہ نہ پڑا ہو اور ان سے متاثر نہ ہوئی ہوں۔ ہمارے ہاں یہ جرائم جس قدر عام ہیں

ہم ہی خوب جانتے ہیں۔ جسے حقیقی معنی میں جُرم کہتے ہیں، اس کی ان قوموں کو ہوا تک نہیں لگی۔ البتہ کبھی کبھی یہ ہوتا ہے کہ کوئی شخص شہد یا دوسری لذیذ چیزوں کو جنھیں یہ لوگ عموماً مل بانٹ کر کھاتے ہیں، چھپا کر رکھ لیتا ہے۔ اس طرح کے لالچی آدمیوں کی بدنامی اور ذلّت ہوتی اور مہماں نواز اور سیر چشم لوگ قدر اور محبت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔

مذہب

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ اولین تہذیب کی جو دو خصوصیات فرض کی گئی ہیں ان میں سے پہلی یعنی یک زوجی اس میں پوری طرح نہیں پائی جاتی اس لیے کہ شادی سے پہلے جنسی تعلقات میں آزادی ہوتی ہے، طلاق کا رواج ہے اور کبھی کبھی ایک مرد کی کئی بیویاں بھی ہوتی ہیں۔ یہ آخری رسم بیرونی اثرات کا نتیجہ ہے۔ دوسری خصوصیت یعنی وحدانیت کا عقیدہ ان سب قوموں میں جو علم الاقوام کی موضوع ہیں، یعنی جو ابتدا میں لکھنا پڑھنا نہیں جانتی تھیں، واضح طور پر موجود تھا لیکن سوا اولین تہذیب کے حاملوں کے کسی قوم میں یہ عقیدہ وضاحت اور وثوق کے ساتھ قائم نہیں رہا کہ معبود صرف ایک ہی جو مخلوق پر مہربان ہے اور خود صاحب اولاد ہے۔ "قائم نہیں رہا" کا فقرہ ہم نے یہاں خاص کر کے استعمال کیا ہے اس لیے کہ تاریخ تمدن کے تقابلی مطالعے سے یہ بات قریب قریب صاف ہو گئی ہے کہ جہاں تک ہم کہہ سکتے ہیں یہ عقیدہ اولین انسانوں میں ابتدا سے

موجود تھا، آگے چل کر اس میں دوسرے عقائد کا میل ہو گیا اور پھر یہ اُن بڑے مذاہب میں جو وحی پر مبنی ہیں کم و بیش صراحت کے ساتھ دوبارہ ظاہر ہُوا۔ اولین تہذیب کے واحد خدا کا تصور عموماً ایک نورِ محض کی حیثیت سے کیا جاتا تھا جس کے جلوے کی کوئی انسان تاب نہیں لا سکتا۔ تاہم ان ابتدائی وحدت پرستوں میں یہ روایت مشہور ہے کہ ایک زمانے میں انسان خدا کے ساتھ رہتا تھا۔ اس مبارک اور ہم آہنگ زندگی میں اس طرح خلل پڑا کہ ان کے بزرگوں میں سے کسی نے غرور میں آکر یہ چاہا کہ خدا سے زیادہ قوت حاصل کرے۔ ظاہر ہے کہ یہ کوشش ناکام رہی اور اس کی سزا میں نورِ ربانی ناشکر گزار زمین سے رخصت ہو کر آسمان پر چلا گیا۔ لیکن یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ انسانی تہذیب کی اس منزل میں خدا کو سورج نہیں قرار دیا گیا۔

اس تہذیب کے حاملوں میں بے ساختہ عبادت کا عام رواج ہے۔ تکلیف اور مصیبت کی حالت میں خصوصاً اس وقت جب منطقہ حارہ کے قدیم جنگلوں میں بجلی کی کڑک سے انسانوں اور جانوروں کے دل دہلتے ہیں، ان کے دلوں سے دُعا کے چشمے اُبلنے لگتے ہیں۔ کسی قسم کی باقاعدہ اور باجماعت عبادت، کوئی مندر مورتی وغیرہ ان کے ہاں نہیں دیکھی گئی۔ البتہ ایک خاص قسم کی قربانی کا سب قوموں میں رواج ہے جو اولین تہذیب کی حامل ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ فصل کے پہلے پھل اور ہر غذا کا پہلا یا اوپر کا حصہ خدا کی نذر کر دیا جاتا ہے۔ اس حصے کو جو بعض اوقات شکار کیے ہوئے جانور کا سر ہوتا ہے پھینک دینے کے معنی نذر دینے والا

یہ نہیں سمجھتا کہ خدا کو ان غذاؤں کی ضرورت ہے بلکہ یہ صرف شکرانہ ہے اس ذات کا جس نے ہر غذا کو اور خود زندگی کو پیدا کیا ہے۔

ان کا معبود عالمِ کُل، قادرِ مطلق اور رحمٰن و رحیم ہے۔ عجیب بات ہے کہ یہی عقیدہ دنیا کے اور بڑے مذاہب میں بھی پایا جاتا ہے اور وہ عام طور پر اس کے قائل ہیں کہ نوع انسان کے مورثِ اعلیٰ خدائے واحد کی اولاد سے تھے اور اس کے حضور میں رہا کرتے تھے یہاں تک کہ انسان اپنی بداعمالی کی بدولت اس سعادت سے محروم ہو گیا۔

کائنات کے متعلق عام خیال یہ ہے کہ وہ "عدم" سے وجود میں آئی اور اس عدم کا ایک مکمل تصور اِن ابتدائی جنگلی قوموں اور برفستان کے رہنے والوں میں پایا جاتا ہے حالانکہ منطقی تعریف کی رو سے عدم کا کوئی صحیح تصور ہو ہی نہیں سکتا بخلاف اس کے نوع انسانی کے مورثِ اعلیٰ یعنی مرد عورت کے پہلے جوڑے کی تخلیق کے بارے میں عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ خدا کی قدرت سے مٹی، لکڑی وغیرہ سے انسان بن گئے۔

اکثر دیکھا گیا ہے کہ یہ لوگ عالمِ طبیعی کی کل اشیا کو جاندار مانتے ہیں۔ پادری و۔ اشمیڈ کا خیال ہے کہ اسے مظاہر پرستی نہیں سمجھنا چاہیے اس لیے کہ نہ ان قبیلوں میں منفرد روحوں یا بھوتوں کا تصور پایا جاتا ہے اور نہ ان کے ذخیرۂ الفاظ میں ان کے لیے کوئی نام موجود ہیں حالانکہ بعد کی تہذیبوں کی یہ ایک عام صفت ہے کہ ان میں مختلف قسم کی روحوں اور بھوتوں کا عقیدہ پایا جاتا ہے۔[56]

یہ عقیدہ بھی عام معلوم ہوتا ہے کہ موت کے بعد ایک اور زندگی آنے والی ہے اگرچہ وہ جسمانی شکل میں نہیں ہوگی۔ اس کے مختلف تصورات کسی قدر مبہم ہیں مگر یہ بات صاف ہے کہ جو لوگ نیک نیت، نیک دل اور دیانت دار ہیں، سچ بولتے ہیں اور مہماں نوازی سے کام لیتے ہیں ان کا انجام کچھ اور ہوگا اور جو اس کے برعکس ہیں ان کا کچھ اور۔

البتہ گناہ کا تصور واضح طور پر موجود ہے۔ جب منطقہ حارہ کے علاقوں میں بادل زور شور سے گرجتا ہے تو اولین تہذیب کے حامل سمجھتے ہیں کہ خدا کی آواز انھیں متنبہ کر رہی ہے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کریں۔ ان قوموں میں یہ بات عام ہے کہ وہ بانس کی کھپچیوں سے اپنی ٹانگوں کے نچلے حصے کو زخمی کرکے اس میں سے خون لے کر بادلوں کی طرف پھینکتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اس طرح توبہ کرنے سے قہرِ الٰہی دُور ہو جائے گا۔ ان چیزوں کو ہم جادو ٹونے کے عقیدے کا پہلا قدم کہہ سکتے ہیں۔

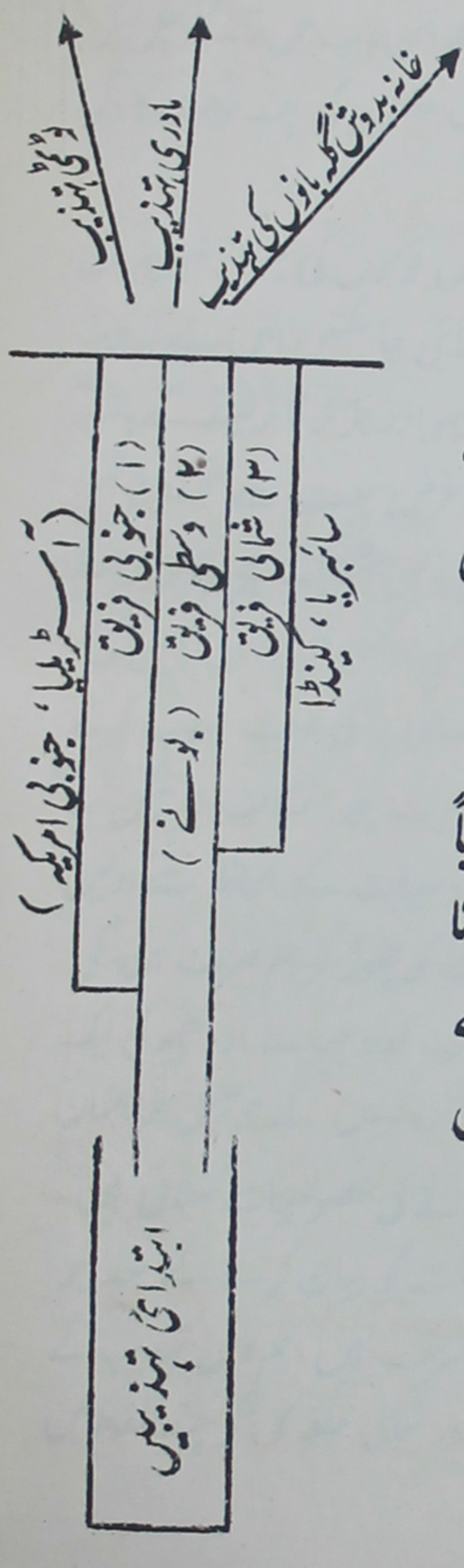
مُردوں کے بارے میں یہ دستور ہے کہ جس جگہ مریں وہیں دفن کردیے جائیں۔ ہاں اگر بیرونی اثرات کی وجہ سے اس دستور میں تبدیلی ہوگئی ہو تو اور بات ہے۔ اس پر سب متفق ہیں کہ مُردوں کے ساتھ ان لوگوں کا جو رویہ ہے اُس میں خوف، ادب اور صدمہ یہ تینوں چیزیں مِلی جُلی ہوتی ہیں۔ جس جگہ کوئی شخص مرتا ہے وہ خالی کردی جاتی ہے اور ایک عرصے تک کوئی وہاں نہیں جاتا۔

سب نے کہا ہے کہ مادّی معلومات اور مسائل کے بارے میں

ان کی عام ذہنیت بھولی بھالی بچوں کی سی ہوتی ہے لیکن زندگی کے اہم معاملات اور مسائل کے متعلق ان کے خیالات معقول، متین اور واضح ہوتے ہیں۔ اس کی کچھ مثالیں ہم اس باب میں آگے چل کر پیش کریں گے جن میں دنیا کے مختلف حصوں کی چند قوموں کا ذکر نمونے کے طور پر کیا جائے گا۔

ظاہر ہے کہ اولین تہذیب کی حامل قوموں کی جسمانی خصوصیات کسی ایک ضابطے کے تحت میں نہیں لائی جا سکتیں، اس لیے کہ ان میں منطقہ حارہ کے بونے، جفاکش اسکیمو اور جزائر فائرلینڈ کے باشندے جنوبی مشرقی آسٹریلیا کے رہنے والے غرض بہت سے مختلف قسم کے لوگ شامل ہیں۔ البتہ ایک چیز ان میں مشترک ہے۔ باوجود دوسری نسلوں سے مخلوط ہونے کے ان میں کسی نہ کسی طرح اس بچپن کی جھلک پائی جاتی ہے جسے ہم "اولین انسانوں" کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ اس اصطلاح کے بارے میں بہت کچھ اختلاف ہے لیکن یہاں مُراد ان لوگوں سے ہے جو جسمانی خصوصیات کے لحاظ سے "اولین انسان" کہلانے کے مستحق ہیں۔ تفصیلات کو چھوڑ کر ہم صرف ان کی تنگ ٹھوڑی، چھوٹی سی زین نما ناک اور چہرے اور جسم کی ایک خاص ساخت اور پستہ قد کی طرف اشارہ کریں گے جو طبیعی علم الانسان کی اصطلاح میں "بنیادی منگولی" نمونے کی خصوصیات کہلاتی ہیں۔

اُن عام صفات اور عام خصوصیات کو بیان کرنے کے بعد جو اولین تہذیب کے اکثر حاملوں میں مشترک ہیں ہم اس تہذیب کے تین جغرافی حلقوں یعنی وسطی، جنوبی اور شمالی حلقہ کا ذکر چند الفاظ میں



اِس نقشے سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(الف) اوّلین تہذیب

کے تینوں فریقوں یعنی وسطی، جنوبی، اور شمالی، فریق کے زمانوں میں اغلباً کتنا فرق تھا۔

(ب) ان میں سے کون فریق اغلباً مادری تہذیب سے تعلق رکھتا ہوگا، کون ٹوٹمی تہذیب سے اور کون خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے ؟

کریں گے۔ اس چھوٹی سی کتاب میں جو علم الاقوام کے عام مسائل پر لکھی گئی ہے، کسی تفصیلی بحث کا موقع نہیں۔ لیکن عام مسائل کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ان تینوں حلقوں سے واقف ہونا ضروری ہے۔

سب سے پہلے ہماری توجہ کا مستحق وسطی حلقہ ہے جو بونوں پر مشتمل ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان لوگوں کے بارے میں سب سے زیادہ اختلافات ہیں اور ان سے اولین تہذیب کی خصوصیات کا سب سے زیادہ پتہ چلتا ہے، بلکہ ان ہندستانیوں کے لیے جو علم الاقوام کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں یہ لوگ یوں بھی خاص طور پر دلچسپ ہیں۔ ان کا ایک حصّہ یعنی وہ ایشیائی حلقہ جو ملاکا میں آباد ہے جغرافی اعتبار سے اور جسمانی اور تہذیبی خصوصیات کے لحاظ سے، جنوبی ہند کی جنگلی قوموں مثلاً کدیر، ارولا، ہسلر اور شلاگا سے، جو مغربی گھاٹ میں رہتی ہیں، تعلق رکھتا ہے۔ ان کے علاوہ وسطی اور شمالی ہندستان کی چنچو، ینادی، اہیر اور بھیل قوموں میں بھی بعض خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ان کا رشتہ وڈّو قوم سے اور بالواسطہ ملاکا کے بونوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ اولین تہذیب کے وسطی حلقے کا ایک حصہ یعنی جزائر انڈمن کے اصلی باشندے گو جغرافی اعتبار سے نہ سہی مگر سیاسی اعتبار سے ہندستان ہی میں شامل ہیں۔ اس لیے اگر ہم سب سے پہلے وسطی حلقے کا ذکر کریں تو بے جا نہ ہوگا۔

اولین تہذیب کا وسطی علاقہ

یہ دو حلقوں پر مشتمل ہے۔ (الف) ایشیائی بونے (ب) افریقہ

کے بونے اور بونوں سے مشابہ قومیں۔

ایشیائی حلقے میں سب سے زیادہ نمایاں جزائر انڈمن کے باشندے ملاکا کی سمانگ قوم، اور جزائر فلّپائن کی ایٹا قوم ہیں۔

(۱) جزائر انڈمن کے باشندوں خصوصاً جنوبی جزیروں کے رہنے والوں میں اولین تہذیب کی بہت سی اصلی خصوصیات اب تک باقی ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ اور غیر معمولی بات یہ ہے کہ وہ لوگ اب تک اپنی ہی زبان بولتے ہیں۔ نہایت تعجب ہے کہ جو مختلف قومیں اولین تہذیب کی حامل ہیں ان میں سے اکثر نے باوجود اپنی قدامت پسندی کے، (جس کی بدولت ان کی معاشرت مذہب اور مادّی تہذیب کا اب تک وہی حال ہے جو دس ہزار برس پہلے تھا) غیر زبانوں کو اختیار کرلیا۔ یہ عجیب بات نہ صرف ایشیا بلکہ افریقہ اور ایک حد تک امریکا میں بھی پائی جاتی ہے۔ انڈمن کے رہنے والوں کا اس قاعدے سے مستثنےٰ ہونا غالباً اس وجہ سے ہے کہ ان کے جزیرے سب سے الگ تھلگ خلیج بنگال میں واقع ہیں اس لیے دوسری قوموں کو ان پر حملہ کرنے کا موقع نہیں ملا اور دوسری زبانیں ان کی زبان کو متاثر نہیں کرسکیں۔ بہت ممکن ہے کہ جزائر انڈمن کی زبان اس بولی سے ملتی جلتی ہو جو ہندستان میں ہزارہا سال تک دراوڑی، آریائی اور سامی قوموں کے حملے سے پہلے بولی جاتی تھی اور جس کی جگہ ان قوموں کی زبانوں نے لے لی۔ یہاں تک کہ کدیر، اِرُولا، چنچو یا ینادی جیسی قدامت پسند قوموں نے انھیں اختیار کرلیا اور بھیلوں میں بھی ایک قسم کی ہندی بولی

رائج ہو گئی۔

جزائر انڈمن کے باشندوں کی مادّی تہذیب یقیناً بہت قدیم اور بالکل سیدھی سادی ہے۔ کاشت کاری سے وہ بالکل ناواقف ہیں۔ کتّوں کے سوا اور کوئی جانور نہیں پالتے اور پتّوں کی معمولی جھونپڑیوں میں رہتے ہیں۔ لیکن ان کی تہذیب پر متعدد بیرونی اثرات صاف نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ خصوصاً وہ جو کنوارے ہیں، بڑی بڑی جھونپڑیاں بناتے ہیں اور انھیں مقرّرہ اوقات پر استعمال کرتے ہیں۔ ان کی کشتیاں ایک طرف جھکی ہوئی ہوتی ہیں جیسی پولی نیشیا خصوصاً بحرِ جنوبی کے مشرقی حصے میں استعمال ہوتی ہیں اور ان کے ہاں ایک خاص قسم کی جھاڑیوں کی باڑ لگائی جاتی ہے، ان سب چیزوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ان جہاز رانوں کا اثر پڑا ہے جو پولی نیشیا اور بحرِ جنوبی کے سب سے پہلے باشندے تھے اور غالباً ایشیا کے اس حصے سے آئے تھے جسے اب چین کہتے ہیں۔ کیا عجب ہے کہ ان منچلے جہاز رانوں میں سے کچھ جزائر انڈمن میں پہنچے ہوں۔ یہ بات تو آسانی سے سمجھ میں آتی ہے، مگر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ خود جزائر انڈمن کے اصلی باشندے ان تہذیبی ترقیوں سے پہلے سمندر کے بیچوں بیچ ان جزیروں میں کیونکر پہنچ گئے۔ جب وہ اپنے موجودہ وطن میں آئے ہیں اس وقت ان کی تہذیب بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ آگ پیدا کرنا، جیسا کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں، ان کو نہیں آتا تھا۔ مگر وہ سیدھے سادے برتن، بغیر چاک کے بنا سکتے تھے۔ ان سب باتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے کئی ایسے فن سیکھ لیے تھے جو

ابتدا میں انھیں نہیں آتے تھے اور یہ غالباً قدیم زمانے میں ان جہازرانوں سے سیکھے تھے جو اُدھر سے گزرتے تھے یا اپنی کشتیوں کے خشکی پر چڑھ جانے کی وجہ سے ٹھیر جاتے تھے۔

اہل انڈمن کی معاشرتی تنظیم اولین تہذیب کا کامل نمونہ ہے۔ وراثت کا دستور اور دُولھا دُلھن کے رہنے کا طریقہ مساویانہ ہے۔ نہ عورتوں کو مردوں پر ترجیح ہے اور نہ مردوں کو عورتوں پر۔ "محرمی" کی رسم لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے ساتھ ساتھ ادا کی جاتی ہے۔

یہی اولین تہذیب کا رنگ ان کے مذہب میں بھی نظر آتا ہے۔ ان کا معبود "پلوگا" کہلاتا ہے اور اکثر اس کا تصور دیوی کی شکل میں کیا جاتا ہے۔ اس دیوی کا تعلق بادل کی گرج سے بالکل ظاہر ہے۔ قربانی ان کے ہاں گویا ایک انفعالی قسم کی ہوتی ہے یعنی جنگل میں جو سب سے زیادہ قابلِ قدر پودے ملتے ہیں ان کا سِرا کاٹ کر پھینکا نہیں جاتا بلکہ استعمال میں لایا جاتا ہے۔ اہلِ انڈمن میں تخلیق کی کہانی اس طرح مشہور ہے کہ انسان کو خدا نے مٹی سے بنایا ہے۔

(۲) ملاکا کی سِمانگ قوم میں بونوں کی خصوصیات اہلِ انڈمن کے مقابلے میں اور بھی زیادہ واضح طور پر پائی جاتی ہیں۔ اس کی اپنی زبان اب باقی نہیں رہی بلکہ وہ آسٹریلیا اور ایشیا کی ملی جلی زبانیں بولتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ اس نے اُن لوگوں سے لی ہے جنھوں نے اس کے ملک پر قبضہ کیا تھا۔ یہ بولیاں ہندستان کے بعض حصوں میں بھی، کہیں کہیں، چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں رائج ہیں۔ مثلاً آسام میں کھاسی اور وسط ہند کے شرقی حصے میں منڈا۔ مگر ان زبانوں کے بولنے والے زیادہ تر ایشیا

کے جنوب مشرقی حصے میں پائے جاتے ہیں۔ اس سوال پر کہ ان زبانوں کو اگری فنی اور پولی نیشائی زبانوں سے کچھ تعلق ہو یا نہیں، آگے چل کر ایک علیحدہ باب میں بحث کی جائے گی۔

سمانگ قوم کی مادّی تہذیب بنیادی طور پر بہت کچھ اہلِ انڈمن کی تہذیب سے ملتی جلتی ہو۔ غذا میں نباتات کا حصہ ان لوگوں کے ہاں اور بھی زیادہ ہو۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہو کہ ان کے ہاں بیرونی اثرات، مثلاً مٹی کے برتن بنانا یا جھاڑیوں کی باڑ لگانا اس وقت تک موجود نہیں تھے، یا کم سے کم دیکھنے میں نہیں آئے، جب تک مشینوں اور انجنوں کے زور نے فطرت کے ان بھولے بھالے بچّوں کی سادگی اور مسرّت کو برباد نہیں کر دیا۔ بانس ان کے ہاں ہر قسم کے اوزار وغیرہ برتن وغیرہ بنانے کے لیے کثرت سے استعمال ہوتا ہو۔ چاقو، ٹوکری کی شکل کی جھونپڑیاں اور کشتیاں سب اسی کی بنتی ہیں۔ سمانگ قوم کی زندگی میں خوبصورت نقشین کنگھیوں کو بڑی اہمیت حاصل ہو اور اس سے ان کا بالواسطہ تعلق، کدیر قوم سے جو ہندستان میں ملابار کی پہاڑیوں میں رہتی ہو، ثابت ہوتا ہو جو جسمانی حیثیت سے بھی ان سے مشابہ ہو۔ ان کا خاص ہتھیار تیر کمان تھا لیکن جب ان پر سکائیوں کے توسط سے ملائی قوم کا اثر پڑا تو یہ دوسرے ہتھیار بھی استعمال کرنے لگے۔

سمانگ قوم کی معاشرتی تنظیم میں پدری وراثت اور مادری وراثت دونوں کے عناصر موجود ہیں اور تمام اہم باتوں میں اولین تہذیب کا نمونہ نظر آتا ہو۔ لیکن بہت سی چیزوں میں عورتوں کا اثر غالب

نظر آتا ہے۔ یہ ابھی تک صاف نہیں ہے کہ عورتوں کا یہ غلبہ قدیم زمانے سے ہے یا آس پاس کی ملائی قوموں کا اثر ہے جن میں کم و بیش وراثت مادری کا رواج ہے۔ پادری شبسٹا نے، جو بہت عرصہ تک سمانگ قوم کے ساتھ رہے ہیں اور اس سے پہلے وسطی افریقہ میں بونوں کی زندگی کا تجربہ حاصل کر چکے ہیں، سمانگ قوم کی ایک نہایت خوبصورت اور ذہین لڑکی کا اور اس سلوک کا ذکر کیا ہے جو وہ اپنے متعدد عاشقوں سے کرتی تھی۔ یہ غالباً ابتدائی قدم ہے چند شوہری، یعنی ایک عورت کے کئی مردوں سے شادی کرنے کی رسم کا جو ہمیں متعدد مادری تہذیبوں میں نظر آتی ہے۔ ۵؎

سمانگ قوم کے مذہب میں بھی اولین مذہب کی خصوصیات موجود ہیں۔ ان کا دیوتا "کرائی" کہلاتا ہے اور بعض اوقات اس کی بیوی بھی اس کی شریک مانی جاتی ہے۔ یہ کہنا مشکل ہے کہ آیا یہ دیوتا کے اس اولین تصور کی یادگار ہے یا نہیں جس میں مرد اور عورت دونوں کی صفات ساتھ ساتھ پائی جاتی تھیں۔ ہمیں یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ سمانگ قوم ۳۰۰ء سے ۱۳۰۰ء تک مان کھمیر حکومتوں کے زیرِ اثر تھی جن میں آسٹریلیا اور ایشیا کی ملی جلی زبانیں بولی جاتی تھیں اور اس کے بعد اہلِ سیام کے حلقۂ اثر میں آگئی۔ چنانچہ بہت ممکن ہے کہ ان کے ہاں شِو شکتی کا تصور پہنچا ہو اور اس نے ان کے معبود کے ابتدائی تصور کو دو حصوں میں یعنی ایک دیوتا اور ایک دیوی کے تصور میں تقسیم کر دیا ہو۔ پھر بھی یہ بات قابل غور ہے کہ ٹانگوں کے پچھلے حصے کا خون نذر کرنے میں عورتیں مردوں سے ممتاز ہیں۔ خیال

یہ ہی کہ دیوتا ان کے سُرخ خون کو جنگلی درختوں کے سُرخ مزہ دار پھلوں میں تبدیل کر دیتا ہی۔ سمانگ قوم والے دنیا کو ایک عظیم الشان ستون تصور کرتے ہیں جس کی چوٹی پر دیوتا رہتا ہی اور وہ اس ستون کو چکّر دیا کرتا ہی جس کی وجہ سے باری باری سے مختلف قسم کے پھل پیدا ہوتے ہیں۔ "محرمی" کی رسمیں عورتوں اور مردوں کے لیے یکساں ہیں۔ دنیا کی تخلیق کی کہانی میں بھی ایک جوڑے کا ذکر ہی جس سے نسل انسانی کا سلسلہ چلا۔

سمانگ قوم کی جسمانی خصوصیات سے یہ پتہ چلتا ہی کہ اُسے لنکا اور جنوبی ہند کی وڈو قوم سے کچھ نہ کچھ تعلق ہی۔ مگر بہ خلاف وڈوؤں کے سمانگیوں کے بال گھونگر والے ہوتے ہیں اور اس سے سمانگ قوم کا رشتہ ملابار کے جنگلی قبیلوں سے ثابت ہوتا ہی۔ افریقہ کے بونوں کو چھوڑ کر سمانگی موجودہ زمانے میں دنیا کی قوموں میں سب سے پستہ قد ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ یہ لوگ خوبصورت اور خوش اندام ہوتے ہیں اور ان کی جلد خوشنما نرم اور سیاہ ہوتی ہی۔ کہاں یہ اور کہاں افریقہ کے بونوں کی جُھلسی ہوئی جلد جس کی وجہ سے جوان بوڑھے معلوم ہوتے ہیں۔ یہی بڑا فرق ہی ان بونوں اور صحت مند چہرے، نرم جلد اور سڈول جسم والے حبشیوں میں۔ لیکن یہ عیب جو افریقہ کے بونوں میں ہی اور ایشیائی بونوں میں نہیں ہی بظاہر قدیم نہیں معلوم ہوتا بلکہ ان خاص حالات کا نتیجہ ہی جو وسط افریقہ کی انتہائی مرطوب آب و ہوا میں پائے جاتے ہیں۔

سب لوگ بالاتفاق یہ کہتے ہیں کہ سمانگی نہایت بامروّت، ہمدرد

نیک دل، ظریف اور نفاست پسند ثابت ہوتے ہیں بشرطیکہ بدیسیوں کا خوف ان کے دل سے نکل جائے مگر یہ بہت مشکل ہے۔

۳۔ تیسری قوم جو اولین تہذیب کے وسطی حلقے کی ایشیائی شاخ سے تعلق رکھتی ہے، جزائر فلپائن کی ایٹا قوم ہے۔ اس نے بھی ایک غیر زبان یعنی ایک انڈونیشیائی بولی اختیار کرلی ہے جو جزائر فلپائن میں بولی جاتی ہے۔ اُس کی تعداد بیس ہزار کے قریب ہے۔ اور اس کا کچھ زیادہ اندیشہ نہیں کہ "مکمل تہذیب" کے مخالف اثرات اس کا خاتمہ کردیں گے۔ یہ بات کہ یہ لوگ کسی زمانے میں اولین تہذیب کے مستقل رکن تھے۔ اس سے ثابت ہے کہ وہ آج تک ایک ایسی زبان میں عبادت کرتے ہیں جسے خود نہیں سمجھتے۔ یہ غالباً ان کی اپنی زبان کی بچی کھچی یادگار ہے جو موجودہ انڈونیشیائی زبان اختیار کرنے سے پہلے بولتے تھے۔

ان لوگوں کا بھی خاص ہتھیار تیر کمان ہی ہے۔ یہ بھی جمع کی ہوئی غذا اور چھوٹے جانوروں کے شکار پر بسر کرتے تھے اور ابتدا میں نہ تو کھیتی کرنا جانتے تھے اور نہ گھر بنانا۔

ان کے معاشرتی نظام میں بھی اسی طرح پدری وراثت اور مادری وراثت دونوں رائج ہیں جیسے اولین تہذیب کے اور حاملوں میں جن کے ہاں مردوں اور عورتوں کے حقوق مساوی ہیں۔

اولین تہذیب کی یہی خصوصیات ان کے مذہب میں بھی پائی جاتی ہیں۔ خدا عام طور پر جان بخشنے والا خصوصاً رزق عطا کرنے والا سمجھا جاتا ہے۔ اس کے معنی ان کے نزدیک یہ ہیں کہ جنگلی سؤر

جن پر زیادہ تر ان کی بسر اوقات ہے انھیں خدا کے فضل وکرم سے میسّر آتے ہیں۔

ایک اور لحاظ سے ایٹا قوم بڑی اہمیت رکھتی ہے یعنی اپنے جغرافی مقام کے لحاظ سے وہ بالکل محدود معنی میں بونوں کی قوم نہیں کہی جاسکتی، لیکن بونوں سے مشابہ ضرور ہے۔ اس طرح وہ بظاہر اس کڑی کی حیثیت رکھتی ہے جو نیوگنی کی کائی قوم اور ہیبریڈیس کے بونوں سے مشابہ قبیلوں کو جن کا بہت کم حال معلوم ہے اولین تہذیب کے وسطی حلقے کی ایشیائی قوموں سے جوڑتی ہے۔ ہم اس بات کو ذہن میں رکھیں گے اور بونوں کی افریقی شاخ کا ذکر کرنے کے بعد ان اہم مسائل پر نظر ڈالیں گے جو ان بھولے بھالے نیک انسانوں کی تمدنی اور جغرافی حیثیت کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں جن کو کم سے کم تہذیب کے لحاظ سے ہم اپنا مورث کہہ سکتے ہیں۔

بونوں اور بونوں سے مشابہ قوموں کی افریقی جماعت کی بہت کم شاخیں ہیں اور ان لوگوں میں ناموافق آب وہوا اور گرد و پیش کی حبشی قوموں کے اثر سے بہت زیادہ تبدیلیاں ہوگئی ہیں۔ سڈول جسم اور لمبے قد کے طاقتور حبشیوں اور ان غریب تنزل پذیر افریقی بونوں میں اس قدر فرق ہے کہ یہ ان حبشیوں کا کسی طرح بھی مقابلہ نہیں کرسکتے اس لیے یہ اور بھی تعجب کی بات ہے کہ حبشی بونوں کو اب تک نہیں نکال سکے حالانکہ یہ ان کے لیے بہت آسان تھا۔ شاید اس کی وجہ وہ مروّت اور مہربانی ہے جو اکثر حبشیوں اور حبشی نما قوموں کی عام صفت ہے۔

افریقی بونوں کی تین بڑی قسمیں یہ ہیں:-

(الف) کانگو کی جماعت جو افریقی کانگو کے وسیع جنگل کے شمال مشرقی گوشے میں آباد ہیں۔ اتوری کے علاقے میں یہ لوگ بمبوتی کہلاتے ہیں اور ایفے، آکا اور باکانگو بونوں پر مشتمل ہیں۔

(ب) مغرب میں کیمرون یا گیبون بونے۔

(ج) جنوب میں بتوا قبائل۔

ان سب افریقی بونوں کی مادّی تہذیب یقیناً وہی تھی جو ہم ایشیائی بونوں میں پاتے ہیں۔ اس کے مختلف بالواسطہ اور بلا واسطہ ثبوت موجود ہیں۔ یہ لوگ نہ تو کھیتی کرنا جانتے ہیں اور نہ سال بھر ایک جگہ جم کر رہتے ہیں۔ لیکن ان کا سارا معاشی نظام اس سے متاثر ہوا ہے کہ وہ حبشیوں سے جو ان سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں اور ان کے گرد و پیش آباد ہیں، میل جول رکھتے ہیں۔ بونے شہد جمع کرتے ہیں، ہاتھیوں کے شکار میں بہت ہوشیار ہیں اور ان کے دانت اور کچھ اور چیزیں حبشیوں کے ہاتھ کیلوں کے بدلے فروخت کرتے ہیں جن کی یہ حبشی کاشت کرتے ہیں۔ بونے اس پُرتکلف غذا کے اس قدر عادی ہوگئے ہیں کہ حبشیوں کے بغیر ان کا کام ہی نہیں چل سکتا۔ اسی طرح وہ حبشیوں کے بعض قبیلوں سے میل جول رکھنے کے عادی ہوگئے ہیں۔ حبشیوں اور بونوں کے قبیلوں میں ایک خاص قسم کا تعلّق ہے جس میں کچھ تو دوستی ہے کچھ تابعداری اور کچھ باہمی حقارت۔ بونے اپنے حبشی مربّیوں کو ایک طرح سے اپنے نوکر سمجھتے ہیں جو ان پر حاوی ہوگئے ہیں اور ان کے لیے کیلے جیسی ضروری چیز فراہم کرتے

ہیں۔ اُدھر طاقتور حبشی بونوں کو بالکل جنگلی قوم سمجھتے ہیں جسے اتنی معمولی چیز یعنی کیلوں کی کاشت کرنی بھی نہیں آتی۔ حبشی جنھیں اولاد کا بہت شوق ہو اور جو افریقہ کے اس حصے میں، کئی کئی بیویاں کرتے ہیں، اکثر بونوں کی لڑکیوں سے شادی کر لیتے ہیں جو کثرت سے بچّے پیدا کرنے میں مشہور ہیں۔ اس طرح غریب بونے مرد اکثر اکیلے رہ جاتے ہیں لیکن اس میں حبشیوں کا کوئی قصور نہیں اس لیے کہ وہ بونوں کی لڑکیوں کو کبھی زبردستی نہیں چھینتے بلکہ خود یہ لڑکیاں خوبصورت حبشی مردوں سے شادی کرنے کو اور ان کی زراعتی بستیوں میں چین سے رہنے کو اس پر ترجیح دیتی ہیں کہ بونوں کے ساتھ رہ کر اِدھر اُدھر سے اکٹھی کی ہوئی غذا پر جس کا کچھ اعتبار نہیں، زندگی بسر کریں۔ ظاہر ہو کہ حبشیوں کا بونوں کی لڑکیوں سے شادیاں کرنا بونے مردوں کو سخت ناگوار ہوتا ہو۔ پھر بھی ان دونوں قوموں کی اتنی انسانیت اور وسعت نظر ہو کہ وہ کھلم کھلا ایک دوسرے کی مخالفت نہیں کرتیں۔ اور نسلوں کے اختلاط کا اچھا اثر پڑتا ہو اور بونوں میں نئی جان پڑ جاتی ہو۔ اس سے یہ امید ہو کہ یہاں اولین تہذیب اور مقابلتاً ترقی یافتہ تہذیب کی کش مکش کا یہ نتیجہ نہیں ہوگا کہ اوّل الذکر کے حامل بالکل ختم ہو جائیں۔ یہ مثال اس شخص کے لیے جو ہندستان کی قوموں کے حالات اور روایات کا مطالعہ کرتا ہو دلچسپی سے خالی نہیں اس لیے کہ یہاں بالکل اسی قسم کے واقعات نظر آتے ہیں۔ جنوبی ہند میں نیل گری اور مغربی گھاٹ کے جنگلی قبیلے مقابلتاً ترقی یافتہ زراعتی قبیلوں مثلاً پریان، چرومان، مالا، مڈیگا، ہولیا وغیرہ کو اپنے سے

کہیں کمتر سمجھتے ہیں۔ حالانکہ وہ علمی معلومات اور معاشی حالت کے لحاظ
سے ان سے کہیں بہتر ہیں۔ ظاہر ہے کہ ہندستان کے ذات پات
کے نظام کی وجہ سے، جس کا افریقہ میں کوئی نام تک نہیں جانتا، کھیتی
کرنے والے کمیرے اتنے حقیر سمجھے جاتے ہیں کہ جنگلی قوموں کی برتری
اور بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ مگر ان قوموں میں تہذیب کے مضر اثرات
کا مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے اور جوں جوں وہ جدید زندگی سے
متاثر ہوتے جائیں گے یہ خطرہ بڑھتا جائے گا کہ وہ بھنگیوں سے بھی
زیادہ نیچ سمجھے جانے لگیں۔ اولین تہذیب کے حقیقی حامل فطری طور
پر کاشتکاری کی زندگی اختیار کرنے سے معذور ہیں ورنہ وہ اس ہزارہا
سال کے عرصے میں اپنی کٹھن زندگی کو ضرور چھوڑ دیتے اس لیے کہ
ان کے آس پاس برابر کھیتی ہوتی رہی ہے۔ لیکن آج کل موٹروں کی
آمد و رفت کی وجہ سے دور افتادہ جنگل بھی، چھوٹے چھوٹے تاجروں
اور محصول جمع کرنے والوں کی زد میں آ گئے ہیں، اس لیے یہ خطرہ
ہے کہ انسانیت کے "سنہری زمانے" کی یہ بچی کھچی یادگاریں بھی جبراً
مزدور بنائی جائیں گی۔ اور جب وہ ایک بار تہذیب کے شکنجے میں
آ گئے تو وہ کسی طرح بھنگی بننے سے محفوظ نہیں رہ سکتے۔ اس لیے
کہ جو لوگ زراعتی مزدور بننے سے انکار کرتے ہیں وہ ہمیشہ اسی پیشے
کے اختیار کرنے پر مجبور کیے جاتے ہیں۔ کاش ہماری سماج اور ہمارا
قومی ضمیر جو پبلک عمارتوں اور رسموں پر لاکھوں کروروں روپیہ صرف
کرنے کے لیے تیار رہتا ہے، تھوڑے سے محصول کی آمدنی کو قربان
کر کے ہمارے سب سے پرانے بزرگوں کی قدیم روایات کو قائم

رہنے دے، جو چند جنگلی قبیلوں کی جفاکشی اور قناعت پسندی کی بدولت آج تک باقی ہیں۔

اس جملہ معترضہ کے بعد ہم افریقی بونوں کی مادّی تہذیب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ بڑی حیرت کی بات ہے کہ ان کی مادّی املاک بالکل اسی قسم کی ہے جیسی ایشیائی بونوں کی حالانکہ ان کے ہمسایوں یعنی حبشیوں کے اوزار، برتن اور جھونپڑیاں وغیرہ ایشیائی بونوں کے ہمسایوں مان کھمیر، سیامی اور ملائی قوموں کی مادّی تہذیب سے مطلق مشابہ نہیں۔ افریقی حبشیوں کا خاص ہتھیار وہی سادہ تیر کمان ہے۔ اسی معمولی گول لکڑی سے بالکل اسی قسم کی کمان اور اسی قسم کا تیر بنتا ہے حالانکہ علم الاقوام کی تحقیقات کے مطابق دوسری قوموں میں تیر کمان کی بہت سی مختلف قسمیں ہیں۔ پتّوں کی سادی جھونپڑیاں بھی ویسی ہی ہیں جیسی ایشیا کے بونوں کی۔ آگ کے استعمال سے یہ لوگ واقف ہیں گو اِتوری بونوں کی ایک جماعت انڈمانیوں کی طرح آگ کو تو جانتی ہے مگر اس کا استعمال نہیں جانتی۔ لباس بھی افریقی حبشی پتوں کا پہنتے تھے جو صحت کے لیے مفید ہے اور ہمیشہ صاف رہتا ہے۔ لیکن آگے چل کر انھوں نے وہ گھٹیا اور مضرِ صحت کپڑے پہننے شروع کر دیے جو یورپ کے تاجر زبردستی مہنگے داموں ان کے ہاتھ بیچتے ہیں۔ ان بے چاروں کو مدّتوں ایک ہی کپڑا پہن کر کام چلانا پڑتا ہے اور اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے کپڑوں میں طرح طرح کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں اور وہ متعدی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ یہ بلا جو بہت سی ابتدائی قوموں کو مٹا چکی ہے، افریقی بونوں کے بہت بری طرح پیچھے پڑی ہے۔ اس لیے کہ ان میں بخلاف

اکثر ابتدائی قوموں کے روزانہ نہانے دھونے کا رواج نہیں ہے۔ یہ بتانا مشکل ہے کہ ان میں یہ گندہ پن کیونکر پیدا ہوگیا۔ بہر حال اس واقعہ سے انکار نہیں ہو سکتا۔

افریقی بونوں کی معاشرتی حالت بھی ایشیائی بونوں سے حیرت انگیز طور پر مشابہ ہے۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق ہر اعتبار سے مساوی ہیں۔ شادی اکثر اس طرح ہوتی ہے کہ ایک قبیلے سے دلھن بیاہ کر دوسرے قبیلے میں آتی ہے اور اُس کے بدلے اِس قبیلے کی لڑکی اُس قبیلے میں بیاہ کر جاتی ہے۔ عام دستور یہ ہے کہ ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرتا ہے مگر کبھی کبھی ایک مرد کی کئی بیویاں بھی ہوتی ہیں۔ جو رجحانات ان لوگوں میں قبائلی تنظیم اور پدری حکومت کے پائے جاتے ہیں اس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ ان کے ہمسایوں، یعنی حبشیوں میں پدری حکومت اور "ٹوٹم" کی پرستش کا رواج ہے۔ جوں جوں ان کے ساتھ میل جول بڑھتا گیا بونوں کے ہاں عورتوں اور مردوں میں تقسیمِ عمل زیادہ نمایاں ہوتی گئی۔ عموماً اولین تہذیب میں ترکاریاں پھل وغیرہ جمع کرنا عورتوں کا کام ہوتا ہے اور شکار کرنا مردوں کا۔ تقسیم محنت کا یہ اصول افریقی بونوں میں زیادہ واضح طور پر عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ایشیائی بونوں کے مقابلے میں ان کی جماعتیں زیادہ بڑی تعداد میں اکٹھی رہتی ہیں۔ اس وجہ سے اس کی ضرورت پڑی کہ اختیارات ایک شخص کے سپرد کر دیے جائیں۔ اس شخص کو اگر "سردار" کہا جائے تو اس سے غلط فہمی پیدا ہوگی۔ یہ بونوں کے مختلف حلقوں کا "بزرگ" ہوتا ہے لیکن اس میں بعض

خصوصیات سردار کی بھی ہوتی ہیں۔ "ٹوٹم" کی پرستش کے جو آثار ان میں نظر آتے ہیں یہ یقیناً حبشیوں کے اثر کی وجہ سے ہیں، جیسے ایشیا کے بونوں تک مادری حکومت کا اثر پہنچا تھا۔

"ٹوٹم" کی پرستش کا اور اس تنظیم کا جو اس پر مبنی ہے، ہم تاریخ علم الاقوام کے باب میں ذکر کر چکے ہیں۔ پھر بھی اس کی مزید توضیح کی ضرورت ہے اور یہ ہم اس باب میں جو ٹوٹمی تہذیبی حلقے پر ہے، پیش کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ بونوں میں ٹوٹم کا جو تصور ہے اس میں قوم کے مورثِ اعلیٰ کا رشتہ کسی خاص جانور سے فرض کرنے کا عام اصول موجود ہے۔ ایک ٹوٹم قبیلے کے کل ارکان اپنے آپ کو ایک دوسرے کا قریبی رشتے دار سمجھتے ہیں اور وہ قبیلے کے اندر شادی نہیں کر سکتے۔ رشتہ عموماً صرف باپ کی طرف سے سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے لڑکوں کی محرمی کی رسم کو زیادہ اہمیت حاصل ہو گئی اور لڑکیوں کی طرف اس معاملے میں کچھ زیادہ توجہ نہیں رہی۔ یہی بات افریقی بونوں کے ہاں نظر آتی ہے۔ "ٹور" ان کے ہاں ایک افسانوی شخصیت ہے جس کا ان رسموں میں بہت اہم حصہ ہے۔ "میگبی" ایک غیر مرئی غیر مادّی قوتِ حیات ہے جو پولی نیشیوں کی "مانا" سے ملتی جلتی ہے اور بونے اس کا تعلق ٹوٹم سے مانتے ہیں۔ ان کی آئندہ زندگی کا عقیدہ بھی ٹوٹم کے تصور پر مبنی ہے اور وہ کہتے ہیں "تم جانور سے پیدا ہوئے اور اسی کی طرف لوٹ کر جاؤ گے"۔ یہ تصور ایشیائی بونوں کے روح اور آئندہ زندگی کے تصور سے، جس میں روحانیت زیادہ اور مادیت کم ہے، صریحاً مختلف ہے۔

مگر یہ امر کہ یہ سب چیزیں بونوں نے حال ہی میں لی ہیں، ان کی خاندانی تنظیم کو دیکھ کر واضح ہو جاتا ہے۔ یہ تنظیم بہت سادہ ہے اور افریقی بونوں پر اس کا اتنا گہرا اثر پایا جاتا ہے کہ یقیناً یہ ان کے ہاں ٹوٹمی تنظیم سے بہت پہلے موجود ہوگی۔

ان کا اولین تہذیب کا حامل ہونا ان کے مذہبی تصورات سے اور بھی واضح ہو جاتا ہے۔ وہ ایک خدا کو مانتے ہیں اور اُسے دُنیا کا خالق جانتے ہیں حالانکہ یہ خیال ان بانٹو حبشی قبیلوں میں موجود نہیں ہے جو ان بونوں کے ہمسایہ ہیں۔ گابون بو نے خدا کو "کاوُم" کہتے ہیں اور دوسرے مختلف قبیلوں میں "اپیلی پیلی" کا نام رائج ہے۔ اور سب خصوصیات مثلاً بے ساختہ عبادت، ہر چیز کے اگلے حصے کی قربانی، جو اتُوری بونوں کے بعض قبیلوں میں کی جاتی ہے، اور پیروں یا ہاتھوں کا خون دیوتا کی نذر کرنا، یہ سب چیزیں ان بنیادی تصورات اور رسوم سے حیرت انگیز مشابہت رکھتی ہیں جو ایشیائی بونوں اور (جیسا کہ ہم اس باب میں آگے بیان کریں گے) ایک حد تک بحر منجمد شمالی اور بحر منجمد جنوبی کے اولین تہذیب کے حاملوں میں پائی جاتی ہیں۔

افریقہ کے بونوں کی جسمانی خصوصیات قریب قریب ایشیائی بونوں کی سی ہیں مگر بہت سی باتوں میں فرق بھی ہے۔ سچ پوچھیے تو کل انسانوں میں صرف ایک افریقہ کے بونوں ہی کی قوم ہے جو بغیر کسی تعصّب یا دشمنی کے، بد صورت کہی جا سکتی ہے۔ ان میں بعض خوبصورت افراد بھی نظر آتے ہیں جو حبشیوں کے میل سے پیدا ہوئے

ہیں۔ ان بونوں کے ہاتھ پانو پتلے اور کمزور، توند نکلی ہوئی اور سر مقابلتاً بڑے اور بھاری ہوتے ہیں۔ آنکھیں ایک دوسری سے بہت دُور ہوتی ہیں اور ناک چپٹی اور چھوٹی ہوتی ہے۔ یہ چیزیں تو ممکن ہے کہ تناسب کے ساتھ ہوں اور بُری نہ معلوم ہوں لیکن غضب یہ ہے کہ افریقی بونوں کی جلد میں بعض ایسے عیوب ہیں جو عموماً دوسرے انسانوں میں نظر نہیں آتے۔ وہ کھُردری اور ڈھیلی ہوتی ہے اور جوانوں تک کی جلد میں نرمی یا جان نہیں پائی جاتی۔ جہاں حبشیوں کی سیاہ، مگر مخمل کی سی، جلد نرمی اور لوچ میں مشہور ہے وہاں بونوں کی پیلی، ہلکی اور بے رنگ جلد، بوڑھوں کی سی بلکہ کبھی کبھی مُردوں کی سی معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ سب عیوب غالباً خلقی نہیں ہیں بلکہ یہ نتیجہ ہیں نہایت گھنے قدیم جنگلوں میں رہنے کا جہاں سورج کی کرنیں جسم کو نہیں چھوتیں اور ہوا میں رطوبت اور خنکی ہوتی ہے۔ بونوں کی یہ مجال نہیں کہ اندھیرے جنگلوں کو چھوڑ کر کھُلے باغوں میں آئیں جہاں حبشی پھلوں کے درخت لگاتے ہیں اور کھیتی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ غالباً وہ تلخ تجربات ہیں جو انھیں پہلے ہو چکے ہیں جب لمبے تڑنگے حبشیوں نے آکر انھیں ان کے گھروں سے نکال دیا اور انھیں جنگلوں میں پناہ لینی پڑی۔ یہی پُرانی نسلوں کی مصیبت ہے۔ وہ اتنی امن پسند اور نیک ہوتی ہیں کہ اپنی زمین کی حفاظت نہیں کر سکتیں۔ افریقی بونے اپنے آپ کو اوّلین انسان سمجھتے ہیں اسی طرح جیسے ہندستان میں بھیل زمین کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔

بونوں کے متعلق بعض مسائل

سب سے اہم سوال جو بونوں کی تہذیب اور ان کی جسمانی خصوصیات کے مشاہدے سے یہ پیدا ہوتا ہے یہ ہے کہ آیا سب بونوں کی اصل ایک ہی ہے یا نہیں؟

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ان کی عمر دوسری انسانی نسلوں کے مقابلے میں کیا ہے؟

بونوں اور ان سے رشتہ رکھنے والی جماعتوں میں باہم اتنی زیادہ مشابہت ہے کہ اُسے محض اتفاق نہیں کہہ سکتے۔ لیکن بعض لوگوں کا نظریہ یہ ہے کہ ممکن ہے یکساں حالات۔ منطقۂ حارہ کے جنگلوں کی رطوبت اور نہایت سادہ غذا۔ کی وجہ سے ان کی صورت شکل یکساں ہو گئی ہو۔ یقیناً یہ ایک حد تک صحیح ہے لیکن یہ ان کی بنیادی مشابہت اور پستی قد کی توجیہہ کے لیے کافی نہیں جس کی اہمیت اس بات سے اور بڑھ جاتی ہے کہ آثارِ قدیمہ کی تحقیقات سے ثابت ہوگیا ہے کہ قدیم زمانے میں خصوصاً عہد قدیم حجری اور عہد متاخر حجری کے درمیان دنیا میں بونے اور بھی زیادہ دور تک پھیلے ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ بونوں کی تہذیب میں اس قدر یکسانی اور مشابہت ہے کہ ہم اسے محض ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں کہہ سکتے۔ معاشرتی تنظیم میں مردوں اور عورتوں کی مساوات، تیر کمان، زیورات اور معمولی اوزاروں مثلاً کھودنے کی لکڑیوں اور آگ پیدا کرنے کے "ہلوں" اور ان سے زیادہ مذہبی اور اخلاقی تصورات کا ہر ایک جزمیں یکساں ہونا،



اس نقشے میں اوّلین تہذیب کی بچی کھچی قوموں کی تقسیم دکھائی گئی ہے؛

شمالی فریق؛

جنوبی فریق؛

وسطی فریق؛

ایشیا اور افریقہ کے بونوں کا تعلق؛

سب بونوں کا "معیارِ کیفیت اور معیارِ کمیت" کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مشابہ اور دوسری قوموں سے مختلف ہونا سب چیزیں اس حد تک پہنچ گئی ہیں کہ ہم کل بونوں کی اصل ایک ماننے پر مجبور ہیں۔ چونکہ ہم اس کی مثالیں تفصیل کے ساتھ پیش کر چکے ہیں، اس لیے یہاں صرف چند باتوں کی طرف اشارہ کر دینا کافی ہے۔ وحدانیت کا واضح تصور جو اس خیال میں پایا جاتا ہے کہ بادل کی گرج اور ندائے الٰہی اور تنبیہہ غیبی ہے، انسان اپنے خون کی نذر پیش کر کے خدا کی برتری کا اقرار کرتا ہے، عقائد کا ایک پیچیدہ سلسلہ ہے اور یہی ایک معیارِ کیفیت اس بات کو ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ بونوں کی مختلف قوموں کی اصل ایک ہے۔ اسی قسم کی اور بہت سی مشابہتیں معیارِ کمیت کا کام دیتی ہیں۔

اب رہا یہ امر کہ جو تہذیب ان بونوں میں مشترک ہے وہی انسانی تہذیب و تمدن کی سب سے سادہ اور قدیم شکل ہے، اس کا واضح ثبوت اولین تہذیب کے دوسرے حاملوں اور بعد کی ترقی یافتہ تہذیبوں سے مقابلہ کرنے سے واضح ہو جائے گا۔

یہ سب چیزیں اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ غالباً ایک طرف ہندستان، مشرقی ایشیا، پولی نیشیا اور ملانیشیا کے جزیروں اور دوسری طرف جنوبی عرب اور وسطی افریقہ میں بونوں کی کم و بیش مسلسل آبادی تھی اور یہ سب لوگ اولین تہذیب کے حامل تھے۔ جب ان کے ملکوں پر دوسری قوموں نے جو سیاسی حیثیت سے ان سے زیادہ طاقتور تھیں، حملہ کیا ہوگا تو یہ لوگ مجبوراً بھاگ کر دشوار گزار

جنگلوں میں چلے گئے ہوں گے جہاں ان میں سے بعض اب تک باقی ہیں اگرچہ ان میں بہت کچھ تبدیلی ہو گئی ہے۔ وہ زمانہ جب بونوں کو فروغ تھا حضرت عیسیٰ سے تخمیناً دس ہزار سال پہلے گزرا ہے۔

اس باب کے بقیہ مضمون میں ہم اولین تہذیب کے ان حلقوں پر اختصار سے نظر ڈالیں گے جو انتہائی شمال اور انتہائی جنوب میں واقع ہیں۔ چونکہ وسطی حلقے کے بیان میں بونوں کی مختلف قوموں کا مقابلہ کیا جا چکا ہے اس لیے یہاں صرف بعض اہم امور کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔ یہ اختصار ایک حد تک ضروری ہے اس لیے کہ ہندستان کے پڑھنے والوں کے لیے اولین تہذیب کے شمالی اور جنوبی علاقے اتنی دلچسپی نہیں رکھتے جتنی وسطی علاقہ رکھتا ہے جس کا ہندستان کی پرانی قوموں سے گہرا تعلق ہے۔

ان بونوں پر جن لوگوں نے کتابیں لکھی ہیں ان کی تفصیل یہ ہے: مسٹر ہٹن جنھوں نے رسالہ "ہٹن" میں انڈمانیوں پر ایک اہم مضمون لکھا۔ پورئین، براؤن، اسکیٹ، بلبڈگن ان سب کی تحریروں کا موضوع ایشیائی بونے ہیں۔

اینڈریوینگ اور پ۔ و۔ اشمٹ نے ان کے مذہب سے بحث کی ہے۔ ژاردیں، ٹریل، شبسٹا، گوسند، وان اوور برگ اور شوماخر نے زیادہ تر بونوں کی افریقی شاخ کے متعلق لکھا ہے۔

اولین تہذیب کا شمالی علاقہ

ناواقف لوگوں کو یہ بات مشکل سے یقین آئے گی کہ منطقۂ حارہ

کے جنگلوں میں رہنے والے بونوں اور شمالی امریکہ کے اسکیمو، سموئیڈ اور دوسرے قبیلوں میں جنھیں ہم اولین تہذیب کے زمرے میں شمار کرتے ہیں کوئی چیز مشترک ہے۔ لیکن واقعہ یہی ہے جیسا کہ ہمیں ان کی نمایاں خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہو جائے گا۔ ہمیں ان کے سارے طرز زندگی میں اولین تہذیب کا رنگ اس قدر صاف نظر آتا ہے کہ دونوں کی اصل ایک ہونے میں کوئی شبہہ باقی نہیں رہتا۔ یہی نہیں بلکہ ان میں ایک خاص مشابہت نظر آتی ہے جو اس پر دلالت کرتی ہے کہ اولین تہذیب کے حاملوں کی مختلف شاخیں جن کے درمیان اب سمندر اور براعظم حائل ہیں، ایک مدت تک ساتھ رہ چکی ہیں۔ ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ ابتدائی انسان بھی جب نقل مکان کرتے تھے تو بڑے بڑے فاصلے طے کر ڈالتے تھے۔ ان کے خیالات کی مشابہت کی ایک مثال وہ کہانی ہے جو دنیا کی تخلیق کے متعلق ملاکا کی سمانگ قوم، وسط ہند کی منڈا قوم، سموئیڈ قبائل اور شمالی سائبریا اور شمالی امریکہ کے دوسرے قبائل میں، جو اولین تہذیب سے تعلق رکھتے ہیں مشہور ہے۔ وہ کہانی یہ ہے کہ خدا نے ایک قسم کے جانور کو (اس کی نوعیت کے متعلق ان قوموں میں اختلاف ہے) مقرر کیا کہ سمندر سے مٹی نکال کر خشکی کی بنیاد ڈالے۔ یہی اس زمین کا مرکز تھا جس پر ہم رہتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اس قسم کا پیچیدہ تصور مختلف قوموں کے ذہن میں الگ الگ پیدا ہوا ہو خصوصاً اس لیے کہ ان کا ماحول ایک دوسرے سے بالکل جدا ہے۔ اسی طرح یہ خیال کہ

سورج اور چاند خدا کی آنکھیں ہیں۔ سمانگ اور سموئیڈ قوموں میں یہ خیال کہ بادل کی گرج اس کی آواز ہی، شمالی امریکہ کے کل بونوں اور یوکی قوم میں پایا جاتا ہی۔ لیکن جب ہم شمالی علاقے کی اولین تہذیب کا مقابلہ وسطی علاقے سے کریں گے تو یہ مشابہت اور بھی زیادہ نمایاں ہوجائے گی۔

جو جماعتیں اس زمرے میں آتی ہیں وہ ایشیا اور امریکا کے انتہائی شمال میں اس طرح پھیلی ہوئی ہیں۔

(الف) بحر منجمد شمالی کی جماعت مندرجہ ذیل قوموں پر مشتمل ہی:۔

(۱) سائبیریا میں قدیم سموئیڈ جو آج کل کی سموئیڈ قوم کے مورث تھے۔

(۲) شمالی امریکہ میں خلیج ہڈسن کے جنوب مغرب اور جزیرۂ گرین لینڈ میں کریبو اسکیمو جو ہرنوں کا شکار کرتے ہیں۔

(۳) سائبیریا کے شمال مشرقی گوشے کی کورجک، شک چین اور اٹامن قومیں۔

(ب) شمالی امریکہ کی جماعت جو مندرجہ ذیل قوموں پر مشتمل ہی:۔

(۱) شمالی وسطی کیلی فورنیا کے باشندے، دریائے سیکریمنٹو کے کنارے رہنے والی یوکی اور مائڈو قومیں۔

(۲) لیبرے ڈور کے جنوب میں الگون کن قوم۔

(۳) برٹش کولمبیا کے مغربی ساحل پر دریائے فریزر اور دریائے کولمبیا کے کنارے سلیش قوم۔

یہ بالکل ظاہر ہی کہ یہ لوگ جس خوفناک آب وہوا میں رہتے ہیں اس نے انھیں اس پر مجبور کیا کہ وہ ٹھنڈی ہوا اور پالے سے بچنے کے لیے خاص وسائل اختیار کریں اور شکار کے لیے بہتر

ہتھیاروں سے کام لیں اس لیے کہ ان کے موجودہ مسکن میں نباتات قریب قریب معدوم ہیں اور انھیں قوی جانوروں کو مار کر ان کے گوشت پر بسر کرنی پڑتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ انھوں نے ان ہتھیاروں وغیرہ کا علم اور ان کے نمونے دوسری قوموں سے لیے ہیں شاید انھیں قوموں سے جنھوں نے ان کو ان کے اصلی وطن سے بھگا کر اس بے آسائش سرزمین میں پہنچا دیا۔ تاہم یہ ظاہر ہے کہ خفیف اختلافات کے باوجود ان سب کی تہذیب اولین تہذیب پر مبنی ہے۔

ان کی مادی تہذیب میں تیر کمان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہ اپنی شکل اور اپنی ساخت کے عام اصول کے لحاظ سے اس تیر کمان سے مشابہ ہے جو منطقۂ حارہ کے جنگلوں میں رہنے والے بونے استعمال کرتے ہیں۔ البتہ وہ اچھی لکڑی کے کمیاب ہونے کی وجہ سے کمان کے لیے مختلف قسم کی ہڈیاں استعمال کرتے ہیں۔ انھیں بہت سلیقے سے جوڑ کر ایسی کمان بناتے ہیں جو معمولی کمان سے زیادہ زور دار ہوتی ہے[1]۔ ہارپون جو ہڈیوں سے بنتا ہے اور ایک لمبی سی رسی سے اٹکا ہوتا ہے، بحر منجمد شمالی کی بڑی مچھلیوں، اور دوسرے بحری جانوروں کے شکار کے لیے بہت عمدہ اور مفید ہتھیار ہے۔ وہ لکڑی جس کے ذریعے سے یہ پھینکا جاتا ہے اور جو ہاتھ کو لمبا کر کے دور تک پھینکنے کے لیے بڑی اچھی چیز ہے، یقیناً باہر سے لی گئی ہے ممکن ہے ان قوموں سے جو ان کے پڑوس میں

---

[1] برچھے کی شکل کا خمدار کانٹا جس سے وھیل وغیرہ کا شکار کرتے ہیں۔

ساحلی اسکیمو قوموں کی سمندر کی دیوی "سیدنا" سے ثابت کیا جاسکتا ہے۔

سموئیڈ قوم اور بونوں کی تخلیق کی کہانیوں میں جو حیرت انگیز مشابہت ہے اس کا ذکر ہم پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اس امر کی کہ اول الذکر کے خدا کے تصور میں قہر کا عنصر زیادہ اور رحم کا کم ہے، بڑی آسانی سے یہ توجیہہ کی جاسکتی ہے کہ بحر منجمد شمالی کے ان بدقسمت شکاریوں کو فطرت قہر و غضب کے رنگ میں نظر آتی ہے۔

لیکن باوجود اس کے کہ یہ لوگ ایسی کٹھن زندگی بسر کرتے ہیں مروت اور مہماں نوازی کا عام دستور ان کے ہاں بھی اسی قدر واضح طور پر نظر آتا ہے جتنا بونوں کے ہاں۔ چوری، ڈکیتی اور دغا بازی سے وہ اُسی طرح ناواقف ہیں جس طرح ان کی مد مقابل قومیں جو منطقہ حارہ میں رہتی ہیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ شکاریوں کی اکھڑ زندگی بسر کرنے کی وجہ سے ان میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑے اور قتل زیادہ ہوتے ہوں۔

زندہ انسان تو درکنار ان کے ہاں لاشوں تک کے کھانے کی سخت ممانعت ہے۔ اس کی پابندی کرنے میں بعض اوقات ان لوگوں کو انتہائی ضبط نفس سے کام لینا پڑتا ہے اور اکثر ان کی جان پر بن جاتی ہے۔ بحر منجمد شمالی کی ان شکاری قوموں میں ایک عرصہ تک شکار نہ ملنے کی وجہ سے فاقوں مر جانا ایک معمولی بات ہے۔ کبھی کبھی یکے بعد دیگرے خاندان کے کل ارکان کا صفایا ہو جاتا ہے۔ موسم بہار میں سیاحوں کو ان کے مُردے اس حالت میں ملتے ہیں

کہ ایک چھوٹے سے خالی لیمپ کے گرد بیٹھے ہوئے ہیں جس کا تیل وہ مدّت ہوئی پی کر ختم کر چکے تھے۔ اگر اس شخص کی لاش کو جو سب سے پہلا مرا تھا بقیہ لوگ کھا لیتے تو شاید ان سب کی جان بچ جاتی مگر وہ یقیناً فاقے اور موت کو انسان کا گوشت کھانے پر ترجیح دیتے ہیں حالانکہ چین کے کسان عام طور پر شدید قحط کی حالت میں لاشوں کو کھا جاتے ہیں۔

ان قوموں کی جُداگانہ خصوصیات کا ذکر بہت دلچسپ ہوگا، لیکن زیادہ تفصیلات کے بیان کرنے سے ان کی تہذیب کا عام خاکہ نظر سے اوجھل ہو جائے گا۔ حالانکہ اگر ہم اولین تہذیب کے حالموں کی باہمی مثابہت کا اندازہ کرنا چاہتے ہیں تو اس خاکے کا نظر میں رکھنا ضروری ہے۔ یہ مقصد اسی طرح حاصل ہو سکتا ہے کہ ان قوموں کی تہذیب کا مقابلہ دوسری منزل کی تہذیبوں سے کیا جائے جو ہم اگلے باب میں کریں گے اس لیے ہم اس بحث کو یہیں ختم کیے دیتے ہیں اور اولین تہذیب کے جنوبی علقے کے ذکر میں بھی جہاں تک ممکن ہے، اختصار سے کام لیں گے۔

شمالی حلقے کے موضوع پر سب سے اہم تحریریں مندرجۂ ذیل مصنفین کی ہیں:-

برکٹ اسمتھ، میتھیاسن، راموسن، گٹمنڈ ہیٹ۔ یہ سب اسکینڈینویا کے باشندے ہیں۔ ٹالبٹسر اور جیسپ مُہم کا رُکن جوکیلسن، ایک روسی ماہرِ علم الاقوام بوگوراس، بیچلر اور اسٹرنبرگ دو تحقیقی سیّاح بھی اس گروہ میں شمار کیے جا سکتے ہیں۔

اوّلین تہذیب کا جنوبی علاقہ

اس علاقے میں دو بَرِّاعظم شامل ہیں اور مندرجۂ ذیل قومیں پائی جاتی ہیں:۔

(الف) آسٹریلیا کی اولین اقوام۔

(۱) جنوب مشرقی آسٹریلیا میں کرنائی اور کولین جن کے معدودے چند آدمی باقی رہ گئے ہیں۔

(۲) ٹسمانوی جو بالکل معدوم ہو گئے ہیں۔

(ب) جنوبی امریکا کی اولین اقوام جو صرف تین ہیں:۔

یمانا، سیلکونام اور ہلاکلوپ۔ بدقسمتی سے یہ قومیں بھی قریب قریب معدوم ہوگئی ہیں ان کی زندگی اور رسم و رواج کا ماہرین علم الاقوام خصوصاً پروفیسر و۔ کوپرس اور ف گوسند نے جنگِ عظیم کے فوراً بعد مکمل مطالعہ کیا ہے۔

(الف) آسٹریلوی جماعت کی مادّی تہذیب بہت سی باتوں میں آسٹریلیا کی دوسری ابتدائی قوموں سے مشابہ ہے۔ یہ بَرِّاعظم اتنا چھوٹا تھا اور مختلف قوموں میں تہذیبی تعلقات اس قدر عام تھے کہ ایک کا اثر دوسرے پر پڑنا لازمی تھا۔ مثلاً بومرانگ[۱] شمالی اور وسطی افریقہ سے جنوب مشرق تک کرنائی اور کولین اقوام میں پہنچ گیا۔ بہ خلاف اس کے ٹسمانوی اپنے جزیرے میں اس ہتھیار کو استعمال نہیں کرتے تھے۔ یہ بات صاف ظاہر ہے کہ اس ہتھیار کا رواج آسٹریلیا کے بَرِّاعظم میں بہت بعد ہوا اور اولین اقوام میں سے صرف کرنائی اور کولین نے اسے اختیار کیا۔ دوسری باتوں کے لحاظ سے ان کی تہذیب اتنی ہی سادہ اور کم مایہ ہے جتنی بونوں کی تہذیب

---

[۱] ایک لکڑی کا ہتھیار جو پھینکنے والے کے پاس لوٹ کر آتا ہے۔

یہ لوگ بھی پتّوں کی جھونپڑیاں یا ٹوکری کی شکل کی جھونپڑیاں بناتے ہیں جو منطقۂ حارہ کے بونوں کی جھونپڑیوں سے اور شمالی اقوام کے برف کے تہ خانوں سے مشابہ ہوتی ہیں۔ بعض چیزیں مثلاً ٹوکریاں بنانے کا سیدھا سادہ طریقہ، سادہ کشتیاں جو صرف سرکنڈے کے گٹھوں سے تیار کی جاتی ہیں، سمور کے کوٹ اور مُردوں کے جلانے کی رسم (اُسی طرز کی جیسی جنوبی امریکا کے اوّلین تہذیب کے حاملوں میں رائج ہے) تہذیب کا ایک ایسا نقشہ پیش کرتی ہیں جو اوّلین تہذیب کے اصلی نمونے سے مختلف ہے۔ لیکن اس کی وجہ ایک حد تک یہ ہے کہ آسٹریلیا کی تہذیب کی ساخت ہی کچھ انوکھی ہے۔ معاشرتی تنظیم میں اوّلین تہذیب کا رنگ زیادہ صاف نظر آتا ہے۔ وراثتِ پدری اور وراثتِ مادری دونوں کا رواج ہے اور مرد عورت دونوں کو قریب قریب یکساں حقوق حاصل ہیں۔ سماجی زندگی کی ساری عمارت خاندان پر کھڑی کی گئی ہے بخلاف اس قبائلی یا قومی یا ملکی تنظیم کے جو ترقی یافتہ قوموں میں نظر آتی ہے اور جس کو ہم وضاحت کے ساتھ آئندہ بابوں میں بیان کریں گے۔ محرمی کی رسموں کو جو پہلے لڑکے اور لڑکیاں دونوں ادا کرتی تھیں ایک اہم کڑی سمجھنا چاہیے جو ان لوگوں کو وسطی علاقے کی اوّلین تہذیب کے حاملوں سے جوڑتی ہے۔ جنوبی افریقہ کی اوّلین قوموں میں بھی محرمی کی رسموں میں لڑکے اور لڑکیاں دونوں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن شمالی علاقے کے اوّلین تہذیب کے حاملوں میں یہ طریقہ نہیں پایا جاتا۔ جنسی ٹوٹم کا تصوّر یعنی ہر ایک جانور (عموماً چھوٹے پرندوں) کو مردوں کی جنس یا عورتوں کی جنس سے منسوب کرنا یقیناً ان لوگوں میں باہر سے آیا ہے۔ ٹوٹم کا اصلی تصور تو خاندانوں یا قبیلوں

کی تقسیم سے تعلّق رکھتا ہے لیکن کرناٰی اور کولین قوموں نے اسے دونوں جنسوں کی تفریق کے لیے استعمال کیا۔

ان کے مذہب میں اولین تہذیب کی سادگی خاص طور پر واضح ہے۔ اپنے معبود کو یہ "منگم نگانا" کہتے ہیں جس کے لفظی معنی ہیں "ہمارا باپ"۔ ان کے ہاں یہ روایت ہے کہ انسانوں کا مورثِ اعلیٰ میاں بیوی کا ایک جوڑا تھا جو خدا کے سایۂ دامن میں امن و عافیت سے زندگی بسر کرتا تھا یہاں تک کہ انسان ایک ایسے گناہ کے مرتکب ہوئے جس کی وجہ سے ان کی راحت و مسرّت کا خاتمہ ہو گیا اور خدا اس ناپاک زمین کو چھوڑ کر چلا گیا وہ بجلی کی چمک میں قوسِ قزح کے حسنِ خاموش میں دکھائی دیتا ہے اور اس کی آواز بادل کی گرج میں سنائی دیتی ہے (قوسِ قزح کو شمالی امریکا کے اصلی باشندوں کی دیو مالا میں بھی بڑی اہمیت حاصل ہے) خدا کی آواز ان کے عقیدے میں اس طرح سُنائی دیتی ہے کہ محرمی کی رسموں کے وقت ان کے بوڑھے پیشوا ایک چھوٹی سی مستطیل شکل کی چپٹی لکڑی کو ڈوری میں باندھ کر چکّر دیتے ہیں اور اس سے بادل کی گرج کی سی آواز پیدا ہوتی ہے۔ محرمی کی رسم کے وقت یہ لوگ بھی وہی اخلاقی ہدایتیں دیتے ہیں جو دوسری اولین قومیں نوجوان لڑکیوں اور لڑکوں کو دیا کرتی ہیں۔ محرمی کی رسم کے زمانے میں بعض کھانوں کی ممانعت جن کی بعد میں رفتہ رفتہ پھر اجازت ہو جاتی ہے، موت کی سی گہری نیند سونا، پھر اس سے خاص اہتمام کے ساتھ جاگنا اور اس کے بعد بڑوں کے زُمرے میں شامل کیا جانا۔ یہ سب چیزیں وہی نقشہ پیش کرتی ہیں جو اولین تہذیب کے دوسرے حاملوں کی محرمی کی رسموں میں نظر آتا ہے۔ آسٹریلیا والوں کی رسموں سے

سب سے زیادہ مشابہ غالباً انڈمن کے اصلی باشندوں کی رسمیں ہیں۔ آسٹریلیا والوں کے ہاں ایک خاص بات یہ ہے کہ جب محرمی کی رسم کے بعد لڑکے طلسمی نیند سے جاگتے ہیں تو وہ سورج کی طرف اچھال دیے جاتے ہیں۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ انھیں جماعت میں شامل کرنے سے پہلے خدا کی نذر کردیا جاتا ہے۔

آسٹریلیا کے اصلی باشندوں میں جو کرنائی اور کوبین قوموں کے پڑوس میں شمال کی طرف رہتے تھے، اولین تہذیب کی بہت سی باتیں موجود تھیں مگر ان کے مذہب میں ستاروں کا دخل زیادہ تھا۔ چنانچہ ویراجوری کمیلا روئی قوموں کی دیو مالا سورج سے اور یوئین کوری کی دیو مالا چاند سے بہت گہرا تعلق رکھتی ہے۔

ان آسٹریلوی قوموں کی جسمانی خصوصیات قطعی طور پر ابتدائی قوموں کی سی ہیں لیکن اس کے ساتھ وہ قدیم یورپی نسلوں کے ساتھ اور سب قوموں سے زیادہ مشابہت رکھتی ہیں سوا دوسری آسٹریلوی قوموں کے (جو تہذیب کے لحاظ سے کرنائی اور کوبین سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں) اور شمالی جاپان کی آئینو قوم کے۔ ان کی طبیعت اور مزاج اولین تہذیب کا پورا نمونہ ہے اور یہ لوگ نہایت نیک اور خوش خلق ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں آسٹریلیا کی تعزیری بستی کے حاکم ان لوگوں پر سخت ظلم کرتے تھے اور انھیں ایک جگہ سے دوسری جگہ کھدیرتے رہتے تھے لیکن لوہے کی زنجیروں میں جکڑے ہونے پر بھی ان کی مروّت اور ہمدردی کا وہی حال تھا۔ ایک مشنری لکھتا ہے کہ یہ بدنصیب قیدی جن سے بلا قصور جبری مشقّت لی جاتی تھی اگر کسی کے ہونٹوں پر دوستانہ مسکراہٹ دیکھتے تھے تو وہ بھی اُسی خوش دلی کے ساتھ

مسکرا دیتے تھے جو آزادی کے زمانے میں اُن کے بزرگوں کی خصوصیت تھی۔
نوجوانوں کو جو اخلاق سکھایا جاتا تھا اس میں بھی اولین تہذیب کا رنگ صاف نظر آتا ہے۔ یہاں اس غلط فہمی کو دُور کر دینا ضروری ہے کہ ابتدائی قومیں ایک ہی نسل اور ایک ہی قسم کی ہیں۔ ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ وسطی، شمالی اور جنوبی علاقے کی اولین تہذیب کے حامل ان ابتدائی قوموں کا محض ایک چھوٹا سا حصہ ہیں جو ساری دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اگر ہم مختلف تہذیبوں کا ذکر جغرافی خطوں کے لحاظ سے کرتے اور یہ دکھاتے کہ بالکل ایک دوسرے کے پڑوس میں رہنے والی قوموں کے خیالات اور عقائد میں کتنا زیادہ اختلاف ہے تو یہ بات اور بھی زیادہ واضح ہو جاتی کہ ہر قوم بجائے خود کس قدر ہم رنگ اور ہم آہنگ ہے اور یہ بھی ثابت ہو جاتا کہ دوسری تہذیبوں کے مقابلے میں اولین تہذیب کا علاقہ کس قدر مختصر اور محدود ہے۔ یہ طریقہ ادیبوں اور فن کاروں کے لیے تو ضرور دلچسپ ہوتا لیکن اس سے تہذیب کے مختلف طبقوں کا وہ نقشہ جو ہم پیش کرنا چاہتے ہیں دُھندلا ہو جاتا۔ چنانچہ اس بات کو ہمیشہ مدِ نظر رکھنا چاہیے کہ اولین تہذیب کے علاقے دوسرے تہذیبی طبقوں کے سمندر کے بیچ میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی حیثیت رکھتے ہیں۔

آسٹریلیا کی اولین تہذیب کے متعلق سب سے ممتاز تصانیف ہاؤئٹ، مالینا وسکی (انگریزی زبان میں) اور فادر کنا بن ہانس اور ہیسڈو کی ہیں۔ نظری مذہبی تہذیب کے مسائل پر وہی و۔ اشمٹ کی تحریریں ہیں۔

(ب) جنوبی امریکا کی جماعت جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں صرف تین چھوٹے چھوٹے قبائل یمانا، سیلکونام اور ہلاکلوپ پر مشتمل ہے۔ ان کے متعلق بجا طور

پر یہ کہا جا سکتا ہی کہ برِاعظم ایشیا سے جو قومیں نقل مکان کر کے سب سے پہلے امریکا پہنچی تھیں یہ قبائل ان کی آخری یادگار ہیں۔ اس کے بعد دوسری تہذیبوں کے حاملوں نے، جو زندگی کی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لیے زیادہ تیار تھے اور شاید زیادہ جنگجو بھی تھے، اگر جزائر فائرلینڈ کے موجودہ باشندوں کے بزرگوں کو رفتہ رفتہ جنوب کی طرف دھکیلا ہوگا، یہاں تک کہ وہ جنوبی امریکا کے انتہائی جنوبی جزائر تک پہنچ گئے جو قطب کے قریب واقع ہیں اور جہاں برف کے قیامت خیز طوفان زندگی کو دشوار اور دوبھر کر دیتے ہیں۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہی کہ اولین تہذیب کے شمالی حاملوں کی طرح جزائر فائرلینڈ کے باشندے بھی اپنے موجودہ تکلیف دہ مسکن میں عام طور پر اب تک وہی اولین تہذیب کا اصلی سیدھا سادہ لباس استعمال کرتے ہیں۔ ظاہر ہی کہ شدید سردی کے موسم میں اور باہر نکلتے وقت وہ سمور کے لمبے کوٹ اوپر سے پہن لیتے ہیں لیکن گرمی میں یا اپنی جھونپڑیوں کے اندر ان کا لباس قریب قریب وہی ہوتا ہی جو منطقۂ حارہ کے بونوں کا۔ سمور کے کوٹ عموماً گُناکو کی کھال کے ہوتے ہیں۔ یہ ایک قسم کا لاما[۱] ہی جس کی اُون میں بہت گرمی ہوتی ہی۔

ان کی غذا کا دارومدار بھی چوپایوں اور مچھلیوں کے شکار پر ہی کیونکہ نباتات بہت کم مقدار میں اور صرف سال کے تھوڑے سے حصے میں میسر آتی ہیں۔ اس لیے اُن کے شکار کے آلات وغیرہ اولین تہذیب کی وسطی اور آسٹریلوی جماعت کے مقابلے میں زیادہ پیچیدہ ہیں لیکن ان میں وہ کاریگری نہیں ہوتی جو شمالی جماعت کے ہتھیاروں میں نظر آتی ہی جس نے غالباً

---

[۱] Llama

اپنے شکاری ہمسایوں مثلاً امریکی ہندیوں، جزائر لیپ لینڈ کے باشندوں اور دوسری مہذب تر قوموں سے بہت کچھ سیکھا ہوگا۔ جنوبی امریکا کی جماعت کی ایک قابلِ ذکر خصوصیت یہ ہے کہ یمانا قبیلہ تو تیر کمان استعمال ہی نہیں کرتا اور سیلکونام اور ہلاکلوپ قبائل بھی بجائے گول لکڑی کی سادہ کمان کے جو اولین تہذیب کا اصلی نمونہ ہے مثلث شکل میں ترشی ہوئی لکڑی کی کمان استعمال کرتے ہیں جو ان سے زیادہ ترقی یافتہ چاکو قبائل کی خصوصیت ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنوبی امریکا کے اولین تہذیب کے حامل تیر کمان کا استعمال بھول گئے تھے مگر ان میں سے بعض نے اسے جاکو قبائل سے دوبارہ سیکھا اور مقابلتاً ترقی یافتہ شکل کی کمان اختیار کرلی۔

ان کے ہاں ہارپون ہڈیوں کو جوڑ کر بڑی کاریگری سے بنائے جاتے ہیں، کشتیاں بھی بنتی ہیں جن میں نہ صرف مرد اور عورتیں سوار ہوتی ہیں بلکہ ایک مٹی کا اونچا چبوترہ بھی ہوتا ہے تاکہ اس پر آگ جلائی جاسکے اور شکاری مردوں اور ان کی عورتوں کو جن کا کام کشتی چلانا ہے گرمی پہنچتی رہے۔ اسی سے ان کے جزیروں کا نام "فائرلینڈ" یعنی "آگ کی زمین" رکھا گیا۔ ٹوکریاں اسی سادہ طریقے سے بنتی ہیں جیسے آسٹریلویوں کے ہاں یعنی جس چیز سے بناتے ہیں اس کے ایک چکر کو دوسرے چکر سے جوڑتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ٹوکری بنانے کا یہ طریقہ عہد قدیم حجری اور عہد متاخر حجری کے درمیان یورپ اور ایشیا میں بھی بہت کثرت سے رائج تھا اس لیے کہ آثارِ قدیمہ کی کھدائی میں مٹی کے برتنوں پر اسی قسم کی جھونپڑیوں کے نشانات نظر آتے ہیں جیسی آسٹریلیا کی اولین اقوام اور جزائر فائرلینڈ کے باشندے اب تک بناتے ہیں۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ان ٹوکریوں پر مٹی چڑھا کر آگ

میں پکا لیتے تھے اور اس طرح ٹوکریاں بنانے سے رفتہ رفتہ مٹی کے برتن بنانے کے زیادہ آسان طریقے ایجاد ہوئے۔ ان کی جھونپڑیاں عموماً معمولی ٹوکری کی شکل کی ہوتی ہیں جیسی ہم اولین تہذیب کے مختلف نمونوں میں پاتے ہیں۔ وہ جھونپڑیاں جن میں مرد عبادت وغیرہ کے لیے جمع ہوتے ہیں (یہ دستور صریحی طور پر اولین تہذیب کے دائرے سے باہر ہے اور کسی اور تہذیب سے لیا گیا ہے) ان سے مختلف یعنی مکعب شکل کی ہوتی ہیں۔

معاشرتی تنظیم اکثر باتوں میں اولین تہذیب کے طرز کی ہے یعنی وراثتِ مادری اور وراثتِ پدری دونوں رائج ہیں لیکن بعض بیرونی اثرات بھی، خصوصاً ایسی قوموں کے جن میں وراثتِ پدری کا رواج ہے، نظر آتے ہیں۔ ملکیت کا نظام ان کے ہاں زیادہ پیچیدہ ہے۔ جو چیز کسی شخص نے اپنے ہاتھ سے بنائی ہو وہ اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ جھونپڑی اور وہ غذائیں جو سب مل کر حاصل کرتے ہیں خاندان کی مِلک ہیں اور خاندان ہی عملی اور معاشی زندگی کا واحدہ سمجھا جاتا ہے۔ شکارگاہوں پر شمالی امریکا کی الگونکن قوم کی طرح کئی کئی خاندانوں کے مجموعے کا تصرّف ہوتا ہے۔ اس مجموعے کو ہم ایک قسم کا قبیلہ کہہ سکتے ہیں اگرچہ اس میں ویسا مضبوط رشتہ اتحاد نہیں ہوتا جیسا حقیقی قبیلے میں۔

محرمی کی رسوم ان لوگوں کی مذہبی اور معاشرتی زندگی میں بڑی اہمیت رکھتی ہیں اور کم سے کم ایک حد تک آسٹریلویوں اور انڈمانیوں کی رسموں سے مشابہ ہیں۔

ان کے مذہب میں بھی مجموعی طور پر وہی وحدانیت کی سادگی اور اخلاقی معیار کی بلندی پائی جاتی ہے جو اولین تہذیب کے دوسرے حاملوں

میں دیکھی گئی ہے۔ خدا کو "وٹاؤنیوا" یعنی "قدیم بزرگ ذات" اور یمانا طبقے والے کرنائی قوم کی طرح "ہٹاپوان" یعنی "ہمارا باپ" کہتے ہیں۔ خدا موت و حیات کا مالک اور رزّاق سمجھا جاتا ہے۔ بے ساختہ عبادت اکثر ہوتی رہتی ہے۔ اسکیمو قوم کی روحِ بحر کی طرح یمانا قبیلے میں "یٹائٹ" یا روح ارض ہے۔

جزائر فائرلینڈ کے متعلق جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے مصنّفوں کی صفِ اوّل میں مشہور و معروف چارلس ڈارون بھی ہے۔ لیکن دوسرے شعبوں میں اس کا مشاہدہ اور تفکر کتنا ہی قابلِ قدر کیوں نہ ہو ان نیک اور بامروّت قوموں کے مشاہدے میں اس نے تعصب سے کام لیا اور غیر علمی شہادتوں پر بھروسہ کیا ورنہ وہ یہ نہ کہتا کہ یہ مردم خور ہیں اور ان کی آواز بھونکنے سے مشابہ ہے۔ حقیقت میں یہ لوگ مردم خوری کا نام تک نہیں جانتے اور یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ اس لیے کہ ان میں اور اسکیمو قوم میں، جس کے متعلق ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ مُردے کا گوشت کھانے سے فاقوں مرجانا بہتر سمجھتی ہے، بہت باتوں میں مشابہت ہے۔ اب رہی ان کی زبان تو ایک مشنری ماہرِ علم الاقوام پادری بریجز نے اس زبان کی ایک لغت تیئس ہزار لفظوں کی تیار کی ہے۔ ف کاپرس اور ف گوسندے نے جزائر فائرلینڈ کے باشندوں کی تہذیب و تمدن کے متعلق بہت قابلِ قدر مضامین لکھے ہیں۔

خاتمہ

اس باب کی تمہید میں مادی، معاشرتی اور مذہبی زندگی کی جن اہم خصوصیات کو ہم نے اولین تہذیب کی علامات قرار دیا تھا وہ ان مختلف

قوموں میں کم و بیش وضاحت کے ساتھ پائی جاتی ہیں۔ تاہم ہر قوم دوسری قوم سے مختلف ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے کسی میں بھی اولین تہذیب بالکل اصلی حالت میں نہیں پائی جاتی۔ مگر ہر ایک کی تہذیب اس سے کم و بیش مشابہ ہے۔

مختلف قوموں کے جغرافی مقامات ان کی باہمی مشابہت اور اختلاف اور ان کے ماحول پر غور کرنے سے (جس کی تفصیلات بیان کرنے میں بہت طول ہو جائے گا) ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ بونوں کی قومیں اولین تہذیب سے سب سے زیادہ قریب ہیں۔ اس کے بعد آسٹریلویوں اور جزائر فائرلینڈ کے باشندوں کا نمبر آتا ہے۔ شمالی سائبیریا اور شمالی امریکا کی جماعتیں غالباً اپنے موجودہ مسکنوں میں بہت دیر میں پہنچیں اور ان پر ان کے پڑوسیوں یعنی خانہ بدوش گلہ بانوں کی حکومتِ مادری پر مبنی تہذیب کا بہت گہرا اثر پڑا۔

اس طرح ہم اولین تہذیب کی حامل قوموں کی عمر کا ایک نقشہ بنا سکتے ہیں۔ اس سے ہمیں نوعِ انسانی کے ابتدائی دور میں تہذیبی ارتقا کے مدارج کا اندازہ ہو جائے گا۔

یہ بات نہایت اہم اور قابلِ لحاظ ہے کہ باوجود ان اختلافات کے جو اولین تہذیب کے دائرے کے اندر موجود ہیں ان سب قوموں میں جو اس تہذیب کی حامل ہیں، بعض اہم خصوصیات پائی جاتی ہیں ان کو ہم اختصار کے ساتھ دوبارہ بیان کیے دیتے ہیں۔

(۱) بالکل ابتدائی معاشی زندگی جو قدرتی غذاؤں کو جمع کرنے پر مبنی ہے۔ سادہ اور کم مایہ مادّی تہذیب جو جغرافی حالات کی تابع ہے۔

(۲) معاشرتی تنظیم میں عورتوں اور مردوں کی مساوات اور اس تنظیم کا خاندان پر مبنی ہونا۔ قبیلے کی صورت صرف محرمی کی رسموں یا غیر معمولی خطروں یا قحط کے زمانے میں پیدا ہوتی ہے۔ ذات پات، طبقے یا نسل کی تفریق معدوم ہے۔ چوری، ڈکیتی اور قتل سے اکثر قومیں ناواقف ہیں یا کم سے کم اس وقت تک ناواقف تھیں جب انھیں زیادہ مہذب قوموں کے سابقہ سے ان کارناموں کا علم ہوا۔ جنسی تعلقات میں عموماً افراد شادی سے پہلے آزاد ہوتے ہیں اور ایک مرد ایک ہی عورت سے شادی کرتا ہے۔

(۳) مذہب میں وحدانیت کا واضح تصور، مورتوں اور شبیہوں، جادو ٹونے اور مشترک عبادت گاہوں تک کا موجود نہ ہونا۔ بے ساختہ عبادت جو کسی ضابطہ کے تحت میں نہیں ہوتی۔ اِشاری قربانیاں جن میں اکثر خود اپنا خون جو عموماً ہاتھوں یا پیروں کے نچلے حصے سے لیا جاتا ہے۔ خدا کا تعلق بادل کی گرج اور قوس قزح سے۔ اس عقیدے کا عام طور پر رائج ہونا کہ انسان کے مورثِ اعلیٰ ابتدا میں معصوم تھے اور انھوں نے خود اپنے گناہوں کی بدولت اپنی سعادت اور مسرت کو برباد کر دیا۔

ان مشاہدات سے دو بنیادی نتائج نکالے جا سکتے ہیں:۔

(۱) ابتدائی انسانی تہذیب کی اصل ایک ہی ہے۔ طبیعی علم الانسان اور حیوانیات وطب کی تحقیقات سے یقینی طور پر ثابت ہو گیا ہے کہ جسمانی حیثیت سے بھی انسان کی اصل ایک ہی ہے۔ اگر ہم ان دونوں اہم باتوں پر ایک ساتھ غور کریں تو ہم لازمی طور پر اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ

(۲) اولین دور کے انسان اگرچہ بہت سی باتوں کے لحاظ سے

بالکل ابتدائی اور سیدھے سادے تھے لیکن نہ وہ وحشی تھے نہ ظالم و بے رحم اور نہ عالی جذبات سے خالی۔

علمی تحقیق ڈارون کے نظریۂ ارتقا کے قطعی دلائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان حقائق کو اپنے سامنے پاتی ہے۔ انسان نما بندر نے ترقی کر کے اولین انسان کی جسمانی شکل اختیار کی ہوگی جس کی ذہنی قوتیں اور جبلتیں تخصیص اور ترقی کے بہت اونچے درجے پر پہنچ گئیں۔ لیکن وہ بنیادی روحانی قوت جس کی بدولت انسانوں نے ایک مکمل زبان بنائی، اوزاروں کا استعمال شروع کیا اور آرٹ کی تخلیق کی صرف ایک ہی انسان میں پیدا ہوئی ہوگی۔ اسی ایک مرکز سے انسانی نسل تمام دنیا میں پھیلی اور رفتہ رفتہ اتنی بہت سی شاخوں میں تقسیم ہوگئی۔ پھر بھی نوع انسانی کی بنیادی وحدت، جسمانی اور تہذیبی دونوں حیثیتوں سے اب تک باقی ہے۔

اس طرح ہم اولین انسان کو فیضانِ الٰہی کا اولین مورد کہہ سکتے ہیں۔ خواہ بندر یا دوسرے جانور کتنے ہی ذہین اور حساس کیوں نہ ہوں، خواہ ان کے دماغ نے جو منطقی خیال سے خالی نہیں اوزار و آلات کا استعمال بھی سیکھ لیا ہو، لیکن انھوں نے اپنی کوئی تہذیب پیدا نہیں کی۔ بخلاف اس کے سطح زمین پر کوئی انسان آج تک ایسے نہیں پائے گئے جن کے پاس کسی قسم کے اوزار و آلات نہ ہوں، جو آگ کا استعمال نہ جانتے ہوں (چاہے آگ بنانا انھیں نہ آتا ہو) جو ایک ایسے شعوری معاشرتی احساس سے خالی ہوں جسے وہ جبلّی طور پر حاصل نہیں کرتے، بلکہ بزرگوں کی زبانی تلقین اور شاندار محرمی کی رسموں کے ذریعے سے۔ کہیں بھی ایسے انسان نہیں دیکھے گئے جن کی کوئی زبان نہ ہو اور جو

رانسانی ارتقا کے ابتدائی دوٗر میں) ایک برتر ہستی یعنی خدا کا گہرا، سادہ، بلند اور واضح عقیدہ نہ رکھتے ہوں۔ کسی جگہ انسان عبادت سے خواہ وہ کتنی بے تکلف اور سادہ کیوں نہ ہو، نا آشنا اور آرٹ سے ناواقف نہیں۔ مختصر یہ کہ کوئی انسانی جماعت تہذیب سے خالی نہیں۔

جہاں تک انسان کی جسمانی وحدت کا تعلق ہے یہاں اس کا موقع نہیں کہ ہم ایک دوسرے علم یعنی علم الانسان کی ایک تفصیلی بحث چھیڑ دیں خواہ وہ ہمارے موضوع سے کتنا ہی گہرا تعلق کیوں نہ رکھتا ہو۔ صرف اتنا اشارہ کافی ہے کہ علم حیوانات کی رو سے ہر قسم کی مختلف نسلوں کے میل سے جو بچے پیدا ہوتے ہیں، خواہ ان کی ماں کہیں کی اور باپ کہیں کا ہو اور ان کی صورت شکل میں کتنا ہی فرق کیوں نہ ہو، وہ اپنی نسل کا سلسلہ جاری رکھ سکتے ہیں۔ ضعیف العقل اور مجنوں اشخاص کو چھوڑ کر ہر انسان ہر ایک قوم یا قبیلے کی زبان کو سیکھ سکتا ہے، اس کے اشخاص سے تعلق پیدا کر سکتا ہے، ان کے خیالات و احساسات و تصورات کو سمجھ سکتا ہے، یہاں تک کہ اس کے اخلاق و عادات اور مذہب کو اختیار کر سکتا ہے، غرض اس کے ساتھ گھل مِل کر ایک ہو سکتا ہے بشرطیکہ وہ ایسا چاہے، بشرطیکہ اس کا ضمیر، اس کا مذہبی عقیدہ یا اس کی روحانی محبت اس کا حکم دے۔

انسان نما بندر نہ تو دوسری قسم کے بندروں کے میل سے بچے پیدا کر سکتے ہیں اور نہ انسانوں کے میل سے۔

یہ بندر اگرچہ مختلف قسم کی آوازوں سے اور حروف علت سے کام لیتے ہیں جنھیں علم حیوانات کے محققوں نے سیکھا ہے لیکن نہ تو

ان کا مطلب پوری طرح انسان سمجھتے ہیں اور نہ دوسری قسم کے بندر۔

ان سب باتوں سے ہم یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ان بندروں اور انسانوں میں جو جسمانی مشابہت ہے اس سے نوعِ انسانی اور نوعِ حیوانی کے عظیم الشان فرق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اس تفریق کی سب سے بڑی علامت مذہب اور تہذیب ہے جسے ہم ایک قدیم اصطلاح کے مطابق "فیضانِ الٰہی" کہہ سکتے ہیں جو اولین انسان کو نصیب ہوا۔

اس اولین تہذیب کی کم و بیش واضح تصویر جو اب تک باقی ہے ہم اس باب میں وسطی، شمالی اور جنوبی جماعتوں کے ذکر میں پیش کر چکے ہیں۔

اولین تہذیب کے دائرے کے اس مرکز سے تین اور تہذیبوں نے نشوونما پائی۔ یہ تہذیبیں ہنوز ابتدائی اور خالص تھیں۔ ان میں سے ایک وراثتِ مادری پر اور دو وراثتِ پدری پر مبنی ہیں۔ اگلے تین بابوں میں ان ہی تین تہذیبوں کا ذکر اختصار کے ساتھ کیا جائے گا۔ جو اولین تہذیب سے پیدا ہوئیں۔

(۱) مادری تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ زراعت کی ایجاد ہے اور اس کا سہرا غالباً عورتوں کے سر ہے۔

(۲) ٹوٹم کی تہذیب کی خصوصیت قبائلی تقسیم ہے جو جانوروں کے ساتھ ایک خیالی رشتے پر مبنی ہے۔ یہ جانور وہی ہیں جن کا گوشت یہ لوگ کھاتے ہیں اور جن کا شکار صرف مرد کرتے ہیں۔ ان کی معاشرتی تنظیم حکومتِ پدری پر مبنی ہے لیکن اکثر اس میں حکومتِ مادری کے بعض عناصر بھی پائے جاتے ہیں۔

(۳) خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی خصوصیت بڑے بڑے

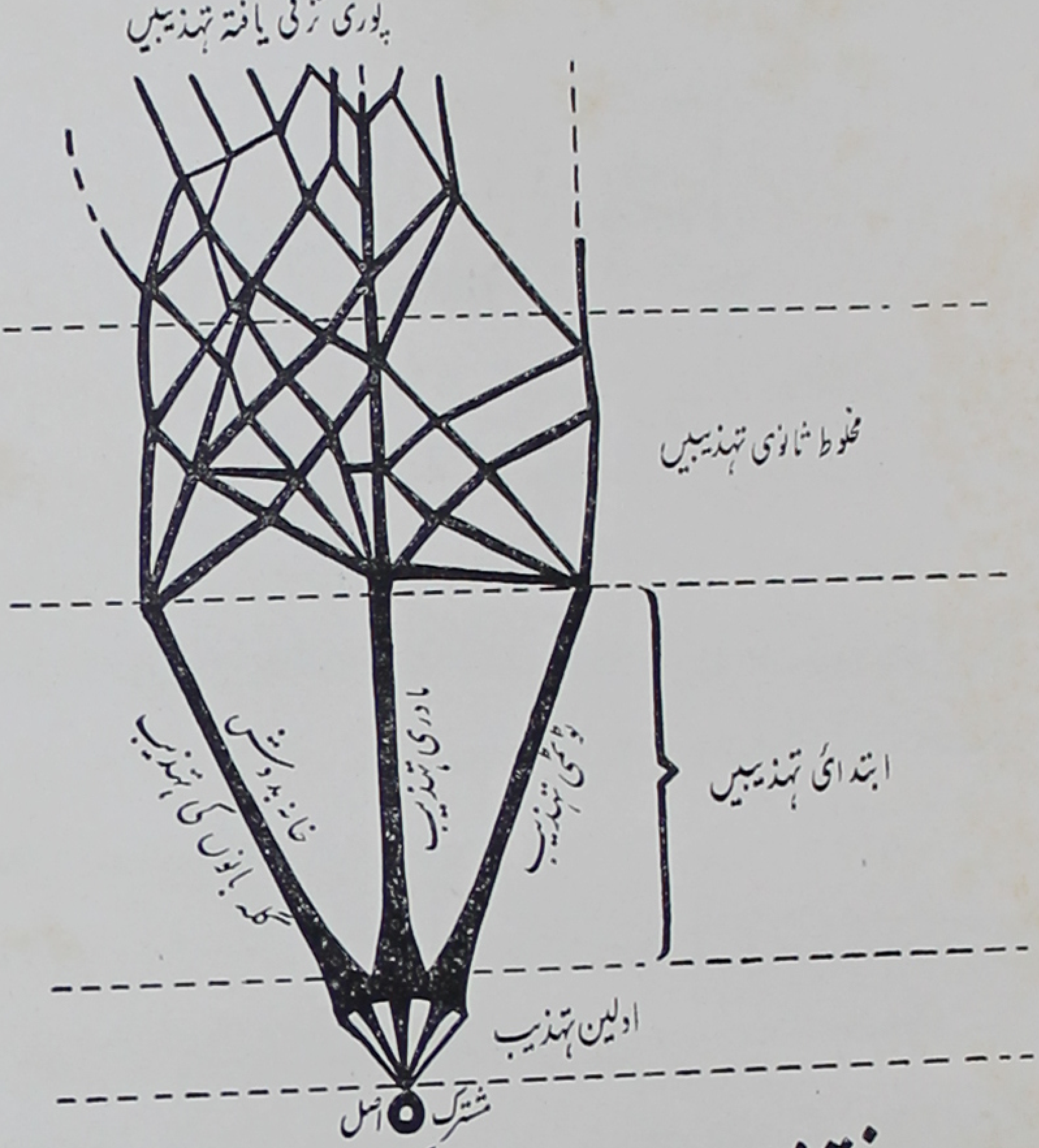
جانوروں مثلاً ہرن، اونٹ، خچر، گھوڑے اور یاک[1] کا پالنا اوران کی افزائش نسل ہے۔ ان سب جانوروں کے بڑے بڑے گلے رکھے جاتے ہیں۔ مویشی اور ہاتھی اس زمرے میں شامل نہیں ہیں۔ان کا پالنا مادری تہذیب میں آگے چل کر شروع ہوا۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں وراثتِ پدری کا رنگ صاف نظر آتا ہے اور عورتیں پستی بلکہ ذلت کی حالت میں رکھی جاتی ہیں۔

یہ خیال دلچسپ ہے کہ یہ تینوں تہذیبی دائرے تہذیبِ اوّلیں تینوں حلقوں کی نشو و نما سے وجود میں آئے۔ وسطی حلقہ مادری تہذیب کی جڑ سمجھا جاتا ہے، شمالی حلقہ خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کا جو شمالی ایشیا میں رہتے تھے۔ جنوبی حلقہ ٹوٹم کی تہذیب کی بنیاد سمجھا جاتا ہے۔

یہ فرضیہ علم الاقوام کے ماہروں کو قابلِ قبول معلوم ہوتا ہے۔ ہم اس کے بنیادی خیال کو پیشِ نظر رکھیں گے مگر آئندہ تین بابوں کے ختم ہونے سے پہلے اس کے متعلق کوئی رائے دینے کی جرأت نہیں کریں گے۔ ان تین بابوں میں ابتدائی تہذیب کے تینوں دائروں کا ذکر ہوگا جنھوں نے اولیں تہذیب سے نشو و نما پائی۔

---

[1] تبت کا پالتو یا جنگلی بیل جس کے بال لمبے ہوتے ہیں اور کوہان بھی ہوتا ہے۔



اِس نقشے سے یہ اندازہ ہوتا ہی کہ اوّلین تہذیب سے تینوں ابتدائی تہذیبیں کیوں کر نکلیں،

ثانوی منزل میں ان تینوں کا آپس میں مخلوط ہو جانا اور آگے چل کر "پوری ترقی یافتہ تہذیبوں" کی شکل اختیار کرنا بھی دکھایا گیا ہی۔

یہ بات قابلِ لحاظ ہی کہ ٹوٹمی تہذیب دوسری تہذیبوں سے کم و بیش الگ رہی،

پانچواں باب

مادری تہذیبیں

قبل اس کے کہ ہم اس تہذیب کی مختلف منزلوں کا ذکر کریں ہمیں اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ (الف) وراثتِ مادری کیا ہو اور (ب) مادری تہذیب کسے کہتے ہیں۔

"وراثتِ مادری" معاشرتی تنظیم کی وہ شکل ہو جس میں عورتیں مردوں پر حاوی ہوتی ہیں اس کی لازمی شرائط حسب ذیل ہیں:۔

(الف) رشتہ باپ کی طرف سے نہیں بلکہ ماں کی طرف سے لگایا جاتا ہو۔ بچے بجائے باپ کے قبیلے کے، ماں کے قبیلے کے رُکن سمجھے جاتے ہیں اور اُسی کے نام سے منسوب ہوتے ہیں۔

(ب) ترکہ صرف عورتوں کو پہنچتا ہو یعنی جہاں وراثتِ مادری کا مکمل نظام رائج ہو وہاں ماں کی وارث لڑکیاں ہوتی ہیں اور انھیں اپنے بھائیوں کی خبرگیری کرنی پڑتی ہو اور وہ اپنی ننھیال کی خدمت کرتے ہیں۔ شادی کے بعد یا تو لڑکا دُلھن کے گھر جا کر رہتا ہو یا اپنی بہن کے گھر رہتا ہو اور کبھی کبھی دُلھن کے گھر چلا جاتا ہو۔ لیکن جس حد تک کسی قوم میں باہر سے وراثتِ پدری کے خیالات پہنچ گئے ہوں اُسی حد تک وراثت کے طریقے میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہو۔ ایک

درمیانی صورت جو عام طور پر نظر آتی ہے یہ ہے کہ جائداد ضابطہ میں تو لڑکی کے نام ہوتی ہے اور وہی اس کی وراثت سمجھی جاتی ہے لیکن اس کا انتظام لڑکی کا بھائی کرتا ہے۔ تاہم وہ اپنا جانشین اپنے بیٹوں کو نہیں بناتا بلکہ اپنے بھانجے کو۔

(ج) یوں بھی ماموں کو اپنے بھانجے کی تعلیم و تربیت وغیرہ میں بہت دخل ہوتا ہے۔ اس کا تعلق ان کے ساتھ باپ سے کم نہیں بلکہ زیادہ ہوتا ہے۔

یہ ہے "وراثت مادری" کا مختصر بیان۔ لیکن مادری تہذیب یہیں تک محدود نہیں بلکہ اس سے زیادہ وسیع چیز ہے۔

"تہذیبی دائرے" کی جو تعریف ہم نے تیسرے باب میں کی ہے اس میں یہ شرط ہے کہ زندگی کے کل عناصر مل کر ایک جسم نامی کی سی وحدت پیدا کرتے ہوں۔ اس طرح کی وحدت مادّی تہذیب معاشرتی تنظیم اور مذہب کے لحاظ سے اکثر قوموں میں جن میں مادری وراثت کا رواج ہے، پائی جاتی ہے۔ پہلی نظر میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ مثلاً زراعت کو مادری تہذیب سے کیا تعلق ہے، لیکن غور کرنے سے یہ تعلق سمجھ میں آجاتا ہے۔ ابھی اس مسئلے پر غور کرنے سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ مادری تہذیب کے دائرے کی وراثتِ مادری کے علاوہ دوسری اہم خصوصیات کیا ہیں۔ یہ خصوصیات حسب ذیل ہیں:۔

(الف) زراعت اور مادّی تمدّن کے دوسرے عناصر جن کا ذکر ہم آگے کریں گے۔

(ب) سماج میں عورتوں کی ممتاز یا کم سے کم معقول حیثیت۔ ہر فرد یعنی عورت اور مرد دونوں کو ایک حد تک شخصی آزادی۔ ایک جمہوری معاشرتی نظام کی طرف رجحان۔

(ج) دیوتاؤں کے بجائے دیویوں کی نمایاں حیثیت۔ اکثر صورتوں میں عورتوں کا پجاری ہونا۔ دیو مالا میں چاند کی اہمیت۔ حشر ارواح کا تصور اور ان رسموں کی نیم مذہبی اہمیت جو لڑکیوں کو پہلی بار حیض آنے کے موقع پر ادا کی جاتی ہیں۔

حقیقی زندگی میں تہذیب کے مختلف عناصر اور پوری پوری تہذیبیں ایک قوم دوسری قوم سے اختیار کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ اندرونی ارتقا اور بیرونی اثرات کی وجہ سے ہر تہذیب کا نقشہ برابر بدلتا رہتا ہے۔ مادری تہذیب کے دائرے کے اندر اس کی تینوں منزلوں کا ذکر کرتے وقت ہمیں یہ بات مدنظر رکھنی چاہیے کہ مادری وراثت اور اس تہذیب میں جسے ہم مادری تہذیب کہتے ہیں، فرق ہے۔

مادری تہذیب کی تین منزلیں

ان کثیر التعداد قوموں کی جن میں مادری تہذیب کا رواج ہے ہم تین منزلیں قرار دے سکتے ہیں پہلی منزل اوّلیں تہذیب سے ملتی جلتی ہے اور آخری منزل شہری ریاستوں مثلاً موہنجو دارو اور ہڑپا کی تمہید سمجھی جا سکتی ہے۔ اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ مادری تہذیب کی ان تینوں منزلوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

پہلی منزل۔ دنیا میں بہت کم مقامات پر اس تہذیب کی پہلی منزل

باقی رہ گئی ہے۔ ملاکا کی جاکُڈ قوم، سماترا کی بامنگ قوم، ہندستان کے بعض جنگلی قبائل اور ایک حد تک شمال مشرقی سائبیریا کے کیمچیڈالی قبائل یا بعض بانٹو قبائل کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے ہاں کم و بیش مادری تہذیب کی پہلی منزل کا نقشہ اب تک موجود ہے۔ لیکن چونکہ ان قبائل میں سے کوئی بھی اپنے ہمسایوں کے اثر سے محفوظ نہیں ہے، اس نقشے کو مکمل کرنے میں ہمیں اپنی طرف سے تصرف کرنا پڑے گا۔

ان کی مادی تہذیب کی خصوصیت زراعت کی ایک ابتدائی شکل ہے جس میں خاص طور پر بعض جڑوں مثلاً رتالو تارافرن[1] اور بعض پھل دار درختوں مثلاً کیلے اور ناریل کی کاشت ہوتی ہے۔ پھل دار درختوں کی کاشت کا خیال غالباً عورتوں کو آیا ہوگا اور انھیں نے اس کی ابتدا کی ہوگی۔ اولین تہذیب کے ہر علاقے میں جڑوں کے جمع کرنے کا کام عورتیں ہی کرتی تھیں، مرد عموماً شکار کیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ یہ بہت قرینِ قیاس ہے کہ عورتوں کی پرورش، ہمدردی اور مامتا کی جبلتیں درخت لگانے کی محرک ہوئی ہوں گی۔ یہ ایک ایسا قدم تھا جو نوعِ انسانی کی آئندہ نشو و نما میں نہایت اہم ثابت ہوا۔ کھودنے کی لکڑی اور کھُرپی یا بیلچہ جس سے زمین کو کھود کر کاشت کے لیے تیار کرتے تھے بھاری پتھر کے کلہاڑے سادے برتن جو غالباً لکڑی کی چکر دار ٹوکریوں کے سہارے سے بنتے تھے اور مستطیل شکل کی جھونپڑیاں ——— یہ ہیں مادی تمدن کی وہ خصوصیات جو تہذیب مادری کی پہلی منزل میں پائی جاتی ہیں۔

معاشرتی زندگی میں بھی یہ تہذیب کئی باتوں کے لحاظ سے اوّلین

---

[1] نیوزی لینڈ کا ایک بڑا فرن درخت جو ترکاری کے طور پر بھی استعمال ہوتا ہے۔

تہذیب سے مشابہ ہے۔ اس میں خاندان وہی اہمیت رکھتا ہے اور بدستور معاشرتی تنظیم کا واحدہ ہے۔ ہنوز ماں کو باپ پر قطعی طور پر برتری حاصل نہیں ہے۔ جس طرح اوّلیں تہذیب میں کبھی کبھی دولھا سسرال میں جاکر رہتا تھا اور اس سے خاندان کے نظام میں کوئی خلل نہیں پڑتا تھا اسی طرح جب زراعت کے رواج سے وراثت مادری کی ابتدا ہوئی اور دولھا کا دُلھن کے گھر جاکر رہنا ایک عام اصول بن گیا تو اس سے باپ کی اہمیت میں کوئی خاص کمی نہیں ہوئی۔ ارتقا کا یہ عمل آسانی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ عورتیں کھیتی کرتی تھیں اور جڑوں اور پھل دار درختوں کی کاشت انھیں کی ایجاد تھی۔ ظاہر ہے کہ ان کے لگائے ہوئے باغ انھیں کی ملکیت ہوں گے اور وہ نہ انھیں چھوڑ کر جا سکتی ہوں گی نہ جانا چاہتی ہوں گی اس لیے مرد آکر ان کے ساتھ رہنے لگے۔ یہ بات مرد کی لاابالی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھی۔ ماموں کی قدر مادری تہذیب کی اس پہلی منزل میں اتنی نہیں جتنی بعد کی منزلوں میں نظر آتی ہے۔ لڑکیوں کی محرمی کی رسم جو پہلی ماہواری "علالت" کے موقع پر ادا ہوتی ہے بہت بڑی اہمیت رکھتی ہے لیکن اس کو سمجھنے سے پہلے یہ جان لینا چاہیے کہ اس تہذیب کے حاملوں کے مذہبی عقائد میں چاند کی کیا حیثیت ہے۔ لڑکے بلوغ کے بعد مردوں کے کلب یا انجمن میں داخل کیے جاتے ہیں جو بالکل علیحدہ ہوتی ہے۔

ان کے مذہب میں جیسا کہ ہم نے اشارتاً اوپر کہا ہے وحدانیت کا عقیدہ چاند کی پرستش کے ساتھ مِلا جُلا ہے۔ چاند کا گھٹنا بڑھنا ان کے نزدیک مذہبی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ چاند کا تصور ایک قابلِ تعظیم ذات

کی حیثیت سے کرتے ہیں اور کبھی اسی کو خدا سمجھ لیتے ہیں اس کی توجیہہ اس طرح کی گئی ہو کہ عورتیں چاند سے ڈہری دلچسپی رکھتی ہیں۔ ایک تو اس کا اثر ان کی ماہواری پر پڑتا ہو دوسرے پھلوں کے پکنے پر۔ شاید بعض لوگ یہ بھی کہیں کہ چاند کے حسین چہرے کا آہستہ آہستہ ہم آہنگی اور موزونیت کے ساتھ بڑھنا، گھٹنا اور پھر بڑھنا عورت کے جذبات و احساسات پر ایک خاص اثر ڈالتا ہو۔ کچھ بھی ہو، بہر حال یہ واقعہ ہو کہ چاند کے تغیّرات، عورتوں کی ماہواری، برسات کے موسم اور زمین کی پیداوار کی قوت ان سب چیزوں میں مادری تہذیب کی پہلی منزل کے لوگ ایک پُراسرار تعلّق سمجھتے ہیں جس کو انھوں نے ایک مذہبی شکل دے دی ہو۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ عورتوں کی پہلی ماہواری کی رسم ان کی مذہبی رسوم میں اس قدر نمایاں کیوں ہو، اور چاند کو اتنی اہمیت کیوں حاصل ہو۔ چاند ان کے نزدیک عورتوں کی زندگی، نباتات اور پھلوں کی زندگی غرض خود سرچشمہ حیات سے بہت گہرا تعلق رکھتا ہو۔ اس کا چھپنا اور نکلنا موت کے بعد زندگی کی علامت ہو۔ اس طرح اس عقیدے کی بنیاد پڑی کہ جسم کے فنا ہو جانے کے بعد روح باقی رہتی ہو اور تہذیبی دائرے میں چاند حیاتِ نو اور نجات کی علامت سمجھا جانے لگا۔ اس زبردست تصور کے بہت سے پہلو ہیں۔ کبھی اس میں جسمانی زندگی مثلاً نباتات کی نشو و نما کو زیادہ نمایاں حیثیت حاصل ہوتی ہو کبھی روحانی زندگی کو۔ مگر بنیادی خیال یہ ہو کہ وہ دیوتا (یا دیوی جیسا اکثر لوگوں کا عقیدہ ہو) جس نے دنیا کو پیدا کیا انھیں ان کی کھوئی ہوئی راحت و مسرت پھر واپس دینا چاہتا ہو۔ یہ ہم پچھلے باب میں کہہ چکے

ہیں کہ اوّلیں تہذیب کے حاملوں کے عقیدے میں انسان کو خدا کا قرب اور حقیقی راحت حاصل تھی جو اس نے اپنی بد اعمالی سے کھودی)۔
بہت سی قوموں کے نزدیک چاند کا اوتار جو اس کا بیٹا یا خاص بندہ ہو دنیا کی نجات کے لیے آتا ہے۔ مگر عام خیال یہ ہے کہ یہ مقصد بغیر اس کی ماں یعنی خود دیوی کی قربانی کے پورا نہیں ہو سکتا (اس قسم کا عقیدہ تخلیق کی اس کہانی میں جو آسام کی کھاسی قوم میں مشہور ہے صاف نظر آتا ہے)۔ اس طرح ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ایک ایسے نجات دہندہ کا عقیدہ جو انسانوں پر رحم کھا کر توفیق الٰہی سے ان کی نجات کا باعث ہوتا ہے، اتنا پُرانا ہے کہ مادری تہذیب کی پہلی منزل میں بھی پایا جاتا ہے۔ عموماً اس شاندار اور بلند تصور کی بانی محرمانِ اسرار کی وہ خفیہ انجمنیں سمجھی جاتی ہیں جو اس تہذیب کی خصوصیات میں داخل ہیں۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ یہ وہی عظیم الشان تصور ہے جس نے مذہب اور تہذیب کی ارتقا کی ہر منزل میں انسانوں کے دلوں کو اُبھارا یہاں تک کہ وہ اپنی بہترین صورت میں دنیا کے بڑے مذاہب میں جو وحیٔ الٰہی کے قائل ہیں، ظاہر ہوا۔ ان سب کی بنیاد مبہم طور پر اسی خیال پر قائم ہے کہ کوئی نجات دہندہ توفیقِ الٰہی سے انسانوں کی دست گیری کرتا ہے اور انھیں اس میں مدد دیتا ہے کہ وہ اپنی کھوئی ہوئی روحانی ہم آہنگی کو دوبارہ حاصل کریں۔ سب سے پہلے اس عظیم الشان حقیقت کا تصور نوعِ انسانی نے چاند کے اوتار کی شکل میں کیا تھا اور یہ تہذیب مادری کے مذہب کا ایک جز تھا۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تھوڑے ہی عرصے کے بعد ان بلند خیال خفیہ انجمنوں کے ساتھ جنھوں نے تہذیبِ مادری کی پہلی

منزل میں اس تصور کو رواج دیا تھا کچھ ایسی خفیہ جماعتیں بھی شامل ہو گئیں جو نقاب پوش روحوں کے بھیس میں سیاسی اقتدار حاصل کرنا چاہتی تھیں لیکن یہ دور مادری تہذیب کی دوسری منزل سے تعلق رکھتا ہے۔

اس سے بہت پہلے حیات بعد ممات کے شاندار عقیدے نے اس مادی تصور کی شکل اختیار کر لی تھی کہ چاند میں اور مردوں کی کھوپریوں میں ایک خاص علاقہ ہے۔ اس کے علاوہ اس عقیدے نے کہ عورتوں کے حیض کے خون میں ایک طلسمی تاثیر ہے اور اسے چاند کے اوتار (یا خود چاند کی دیوی) کی قربانی سے تعلق ہے، مادیت پرستی میں اور اضافہ کر دیا۔ شاید تہذیب اوّلیں کی یہ رسم بھی کہ لوگ خود اپنا خون دیوتا کی نذر کرتے تھے اس مادری عقیدے پر مبنی ہے کہ انسانی خون سے زمین کی زرخیزی بڑھ جاتی ہے۔ اگرچہ انسانی قربانی اور سر کاٹنے کا مادری تہذیب کی پہلی منزل میں کہیں پتہ نہیں چلتا لیکن اس قسم کے انحرافات کی جڑ یہیں پائی جاتی ہے۔ یہ خیال بھی کہ انسان کی ہڈیاں اس کے مرکر زندہ ہونے میں بہت مدد دیتی ہیں، چاند سے کچھ نہ کچھ تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ دُہرے دفن کی رسم (جس میں ہڈیاں محفوظ رکھی جاتی ہیں) ایک بالواسطہ نتیجہ ہے اس مذہبی اہمیت کا جو چاند کو دی جاتی ہے یعنی تہذیبِ مادری کے مذہب کا لیکن اس رسم کا رواج بھی زیادہ تر تہذیب مادری کی دوسری اور تیسری منزل میں ہے۔ چونکہ یہ منزلیں تہذیبی ارتقا کا نتیجہ ہیں اور ہم ہر مظہر تہذیب کی نشوونما ابتدا سے دکھانا چاہتے ہیں اس لیے اس کے بغیر چارہ نہیں کہ جب

پہلی منزل میں کسی چیز کا ذکر آئے تو ہم اس بات کی طرف اشارہ کر دیں کہ اس نے بعد کی منزلوں میں کیا صورت اختیار کی۔

مادری تہذیب کی پہلی منزل میں ایک قسم کا پتیوں کا فراک پہنا جاتا تھا۔ اور ان قوموں میں جو اس کی حامل تھیں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ آرائش میں خمدار لکیروں سے کام لیں۔

دوسری منزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ قبیلہ دو فریقوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے، اسی کو "دوئی کا طریقہ" کہتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ کل مادری تہذیبیں اس دوْر سے نہیں گزریں بلکہ بعض پہلی منزل سے براہِ راست تیسری منزل میں پہنچ گئیں اور انھیں نے وہ بنیاد قائم کی جس پر مہنجو دارو کے نمونے کی شاندار شہری تہذیبیں تعمیر ہوئیں۔

پھر بھی ہمیں اس پہلی منزل اور اس کے مخصوص "دوئی کے طریقے" کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے۔ خصوصاً اس وجہ سے کہ یہ طریقہ جنوبی ہند کے کاشتکاروں اور دستکاروں میں اب تک باقی ہے۔ یہ لوگ اب بھی داہنے اور بائیں فریق میں تقسیم ہوتے ہیں۔ یہ تقسیم غالباً ابتدا میں ازدواجِ خارجی کے اصول کے تحت میں کی گئی تھی۔ فریقِ الف کے مردوں کو اپنی جماعت کے اندر شادی کرنے کی اجازت نہیں تھی بلکہ وہ صرف فریقِ ب کی کسی لڑکی سے شادی کر سکتے تھے۔ اسی طرح فریقِ ب کے مرد صرف فریق الف کی لڑکیوں سے شادی کر سکتے تھے۔ ممکن ہے کہ ازدواجِ خارجی کی رسم ٹوٹم کے ماننے والے قبیلوں کے اثرات کا نتیجہ ہو۔ آگے چل کر ان دونوں فریقوں میں معاشرتی یا مذہبی تفوق کے لیے نزاع شروع ہو گئی۔ ان فریقوں کو عموماً سیاہ اور سفید، داہنا اور

بایاں کوّا اور باز کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس کی اصل بھی چاند کی دیومالا معلوم ہوتی ہے جس میں چاند کے روشن اور تاریک حصے آپس میں بھائی بھائی سمجھے جاتے ہیں یا ان میں کوئی اور رشتہ فرض کیا جاتا ہے۔ مادری تہذیب کی دوسری منزل سے تعلق رکھنے والی قوموں کی مادّی، معاشرتی اور مذہبی تہذیب پہلی منزل والوں کے مقابلے میں عموماً زیادہ پیچیدہ اور ترقی یافتہ ہوتی ہے۔ پھر بھی اس کا پتہ چلتا ہے کہ دوئی کا طریقہ اور اس کے ساتھ مادریِ تہذیب کی دوسریِ منزل گانوٗ کی منتقل زندگی کا رواج ہونے سے پہلے شروع ہو چکی تھی۔

اس دوسری منزل کے آثار خصوصاً دوئی کا طریقہ، دنیا کے ہر حصے میں پھیلا ہوا ہے۔ لیکن اب وہ مادری تہذیب کی تیسری منزل کے ساتھ پایا جاتا ہے پھر بھی غور سے مطالعہ کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سب قوموں میں دوئی کا طریقہ تہذیبی ارتقا کے ایک پُرانے دوٗر یعنی مادری تہذیب کی دوسریِ منزل میں شروع ہوا تھا۔

اس دوئی کے طریقہ کے آثار جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں جنوبی ہند میں آسام کے کھاسی اور گیرو قبیلوں میں اور شاید ناگا قبیلے میں بھی پائے جاتے ہیں۔ انڈونیشیا کے مشرقی جزائر خصوصاً جزیرۂ سیرام میں بھی اس کا پتہ چلتا ہے۔ اس طریقے اور اس سے متعلق عام تہذیب کے کچھ بچے کھچے آثار جاپان کی قدیم روایات میں بھی موجود ہیں۔ شمالی ایشیا میں دوئی کے طریقہ کا صاف پتہ چلتا ہے لیکن یہاں وہ پدری تہذیب کے ساتھ مل گیا ہے جس کی وجہ غالباً نقلِ مکان اور بیرونی اثرات ہیں۔ وہاں خانہ بدوش گلہ بانوں کے کئی قبائل میں ہم ریچھ اور خرگوش یا

عقاب اور ریچھ، یا کالی ہڈی اور سفید ہڈی والے قبیلوں کی تقسیم پاتے ہیں۔ ملانیشیا، خصوصاً ینوگنی میں اصلی دوئی کا طریقہ مادری تہذیب کی دوسری منزل کے ساتھ عام طور پر رائج ہے۔ اس کے آثار بہت کثرت سے پولی نیشیا (خصوصاً جزائر مارکوئی زاس) اور آسٹریلیا، خصوصاً وسطی اور شمالی آسٹریلیا کے ان قبیلوں میں جو مادری تہذیب کے حامل ہیں، پائے جاتے ہیں۔ ان کے ہاں ہر قبیلہ چار اور کبھی آٹھ فریقوں میں تقسیم ہوتا ہے۔ اسی قسم کا طریقہ شمالی امریکہ کی کواکیوٹل قوم میں جو مادری تہذیب کی حامل ہے شمال مغربی ساحل کی سلیش قوم میں شمال مشرق کی اراکواس قوم میں، جنوب مشرق کی مسکوگی قوم میں رائج ہے۔ اور ان کے علاوہ سیوکس اور مشرقی پیوبلوس میں بھی پایا جاتا ہے، جہاں پدری تہذیب کا رواج ہے اور یہ طریقہ غالباً باہر سے پہنچا ہے۔ اس کے کچھ آثار وسطی امریکا میں بھی پائے جاتے ہیں۔ پیرو کی کیچوا قوم اور جنوبی امریکا کی بورورو، مندورو اور چرنٹ قومیں اصلی دوئی کے طریقے اور مادری تہذیب دونوں کی حامل ہیں۔ مگر اس بات کو ملحوظ رکھنا چاہیے کہ جیسا ہم نے اوپر کہا ہے مادری تہذیب نے بہت سی قوموں میں رفتہ رفتہ بہت ترقی کرلی ہے لیکن اس سے ہمیں دوئی کے طریقہ کا زمانہ متعین کرنے میں غلطی نہیں کرنی چاہیے۔

افریقہ میں دوئی کے طریقے کا کہیں نام تک نہیں۔

اکثر دوئی کا طریقہ ٹوٹم کی تہذیب کے ساتھ پایا جاتا ہے حالانکہ یہ جیسا ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، بنیادی طور پر پدری تہذیب ہے۔

اس لیے ہم یہ فرضیہ قائم کر سکتے ہیں :-

غالباً مادری تہذیب کی دوسری منزل میں ان ہمسایوں کے اثر سے جو ٹوٹم کی تہذیب کے حامل تھے کسی مقام پر دوئی کا طریقہ پیدا ہوا ہوگا اس طریقہ کے اندر پھیلنے کی قوت موجود تھی جس کی بدولت یہ دُنیا کے ہر حصے میں پھیل گیا اور بہت سی قومیں جن کی تہذیب مادری تہذیب نہیں تھی اس سے متاثر ہوئیں۔ لیکن بعض مادری تہذیب کی حامل قوموں پر اس کا اثر نہیں پڑ سکا۔ اس اثنا میں دوسری قوموں نے جو مادری تہذیب کی حامل تھیں گانو کی تہذیب پیدا کی جسے ہم مادری تہذیب کی تیسری منزل کہتے ہیں اور یہ وہ بنیاد تھی جس پر آگے چل کر یعنی ۳۰۰۰ ق م کے لگ بھگ) سب سے پہلی شہری ریاستیں قائم ہوئی ہوں گی۔ گو مادری تہذیب کی تیسری منزل بہت طویل عرصے کے بعد وجود میں آئی ہوگی لیکن ہمارا قیاس یہ ہو کہ اس کی بعض خصوصیات دوسری ہی منزل میں پیدا ہو چکی ہوں گی۔ مثلاً ماموں کی اہمیت، مردوں کا عمر بھر اپنی ماں یا بہن کے گھر رہنا اور اپنی بیوی بچّوں سے ملنے کے لیے صرف کبھی کبھی جانا، مردوں کی خفیہ انجمنوں کا سیاسی رنگ اختیار کرنا اور زمین کی زرخیزی کو بڑھانے کے لیے انسانوں کی قربانی کرنا۔ اسی طرح بزرگوں کی پرستش، ان کی چھوٹی چھوٹی مورتیں بنانا، دُہرے دفن کی رسم یہ سب چیزیں بھی غالباً مادری تہذیب کی دوسری منزل ہی میں ظہور میں آچکی ہوں گی۔

مادری تہذیب کی تیسری منزل کی بنیاد مشترکہ مادری خاندان پر قائم ہی۔ لوگ مستطیل شکل کے بڑے بڑے دیہاتی مکانوں میں رہتے

ہیں۔ان کی معاشی زندگی کاشتکاری پر بمنی ہے۔ ابتدا میں وہ کئی قسم کی جڑوں اور پھل دار درختوں کی کاشت کرتے تھے۔ آگے چل کر دھان اور دوسری چیزوں کی کاشت بھی کرنے لگے۔ وہ چھوٹی قسم کے گھریلو جانور پالتے ہیں جن میں سُور بھی شامل ہیں۔ اس تہذیب کے موجودہ حامل زیادہ تر وہی لوگ ہیں جن کے ہاں دوئی کا طریقہ رائج ہے جس کا ذکر ہم اس باب کے پہلے حصے میں کر چکے ہیں۔ مگر ان کے علاوہ وسطی در شمالی افریقہ، انڈونیشیا کے ایک حصے اور قریب قریب کُل مشرقِ ادنیٰ میں بھی یہ تہذیب پائی جاتی ہے۔ مشرقِ ادنیٰ میں اس کا پتہ صرف متاخر عہدِ حجری میں چلتا ہے۔ ایک تو اس بات سے، دوسرے اس سے کہ بہت سی ترقی یافتہ مادری تہذیب کی حامل قوموں (مثلاً جنوبی ہند کی نائر، ٹیا اور بنٹ قوموں) کی دیو مالا اور عام طرزِ زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ دوئی کا طریقہ مادری تہذیب کی سب منزلوں میں موجود نہیں تھا۔

عہدِ متاخر حجری کے ابتدائی دور میں گول کلھاڑے کی تہذیب جو ایک طرف جنوبی چین سے لے کر اوشیانا تک اور دوسری طرف وسطِ ہند تک پھیلی ہوئی تھی، ان ہی لوگوں کا کارنامہ ہے جو مادری تہذیب کی تیسری منزل سے تعلق رکھتے تھے۔ کھوپری میں جادو کی تاثیر کا عقیدہ اور سر کاٹنے کی رسم یقیناً اس تصور پر بمنی ہے جس کے مطابق چاند زندگی کی علامت سمجھا جاتا تھا لیکن کھوپری کے متعلق دوسرے توہمات آگے چل کر مادری تہذیب کی دوسری اور تیسری منزل میں پیدا ہوئے۔ انسان کی کھوپری میں وہی جادو کی تاثیر مانی جاتی تھی

جس سے چاند (اور بالواسطہ زمین) وجود میں آئی۔ یہ ہم پہلے دیکھ چکے
ہیں کہ اس تصور کی بدولت دُہرے دفن کی رسم کو کس قدر فروغ ہوا۔
جو لوگ خاص طور پر قابلِ عزت سمجھے جاتے تھے ان کی کھوپریاں ایک
قسم کے صندوقوں میں یا پتھر کے تابوتوں میں محفوظ رکھی جاتی تھیں۔
جس طرح چاند کے اوتار یعنی نجات دہندہ کی قربانی کا عقیدہ جو ابتدا
میں ایک بلند خیال تھا آگے چل کر مسخ ہو گیا اور اس سے انسانی
قربانی کی بنا پڑی (یہ یادگار تھی چاند کے اوتار کی قربانی کی اور اس
کی غرض یہ تھی کہ زمین کی زرخیزی بڑھ جائے) اُسی طرح یہ عقیدہ کہ
کھوپری جادو کی تاثیر رکھتی ہے، بگڑ کر اس کا محرک بن گیا کہ لوگ اپنی
قوّت کو بڑھانے کے لیے زیادہ سے زیادہ انسانوں کے سر کاٹ کر اپنے
پاس رکھیں۔ اس لیے انسانی قربانی اور سر کاٹنے کی رسم دونوں کو ہم
مادری تہذیب کی تیسری منزل کی بگڑی ہوئی رسموں میں شمار کرتے
ہیں۔ لیکن ان کی ذہنی بنیاد اس تہذیب کی پہلی ہی منزل میں پڑ چکی
ہو گی۔ مزید برآں بعض شاہدات اور قرائن سے پتہ چلتا ہے کہ ان کا
بنیادی خیال اس سے بھی زیادہ پُرانا ہے اور اس کا سلسلہ اولیں تہذیب
تک پہنچتا ہے۔ انڈمانی قوم کی بیوہ عورتیں اپنے مردہ شوہروں کی کھوپری
کی ہڈیوں کو سُرخ رنگ کر اپنے پاس رکھتی ہیں اور بیٹھ کر ان پر رویا
کرتی ہیں۔ ان ہڈیوں کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے۔ اسی قسم کی رسمیں تسمانیا
اور جنوبی امریکا میں بھی اولین تہذیب کے حاملوں میں دیکھی گئی
چین میں کھدائی کے ذریعے سے پیکنی آدمی کی کھوپریاں نکلی
ہیں، انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ ان سے قبل تاریخی

انسانوں کے مرنے کے بعد ان کی کھوپری کی ہڈیوں کے ساتھ بھی یہی برتاؤ ہوتا تھا۔ اس سے صریحاً یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جو عقیدہ آگے چل کر انسانی قربانی اور سر کاٹنے کی رسم کا باعث ہوا اس کی جڑ خود اوّلیں تہذیب میں موجود تھی۔ اور اس تعلق کا تصوّر جو انسان کی کھوپری (یا اس کے خون کو) چاند کے اوتار اور زمین کی زرخیزی (یا زندگی اور قوت) سے ہے، مادری تہذیب کی ابتدائی منزلوں میں پیدا ہوا، اور تیسری منزل میں مسخ ہو کر رہ گیا۔ ان رابطوں اور علاقوں کے مشاہدے سے ہمیں یہ سبق ملتا ہے کہ اس قسم کے نتیجوں پر پہنچنے میں جلد بازی سے کام نہ لیں کہ "مادری تہذیب انسانی قربانی اور سر کاٹنے کی رسم کی ذمہ دار ہے اس لیے یہ ظالموں اور خونخواروں کی تہذیب ہے"۔ سچ پوچھیے تو معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ جیسا ہم کہہ چکے ہیں چاند کے اوتار (یا اس کی ماں یعنی خود دیوی) کی قربانی، حیات بعد ممات، برتر روحانی زندگی اور اسی قسم کے تصورات جو دنیا کے اعلیٰ مذاہب کے ناگزیر عناصر ہیں دراصل مادری تہذیب کی ابتدائی منزلوں میں پیدا ہوئے تھے۔ لیکن آگے چل کر یہ بلند خیالات غلط تاویل سے بگڑے ہوئے اور مادیت کے رنگ میں رنگے ہوئے نظر آتے ہیں۔ تہذیب کے پیام، یعنی اوتار کی قربانی کی کہانی، جو روحانیت کا اعلیٰ سبق سکھاتی تھی، اس طرح دُہرائی جاتی ہے کہ انسانوں کو وحشیانہ ظلم کے ساتھ بھینٹ چڑھاتے ہیں تاکہ زمین کی زرخیزی بڑھ جائے۔ انسان کی کھوپری، انسانی دماغ اور اس قوتِ تخلیق میں، جس کا مظہر چاند ہے، باہمی تعلق کا گہرا عقیدہ مسخ ہو کر اس وحشیانہ عقیدے کی شکل اختیار کر لیتا ہے کہ اپنی

قوت بڑھانے کے لیے بے گناہ انسانوں کا سر کاٹ لینا چاہیے۔ اس عقیدے میں کہ قوتِ حیات انسان کے سر میں ہوتی ہے اور چاند سے تعلق رکھتی ہے، تھوڑی سی ترمیم ہونے کے بعد سر کی جگہ بال قوتِ حیات کا مرکز سمجھے جانے لگے۔ شمالی امریکا کے اصلی باشندوں اور یورپ کی کیلٹ اقوام میں سر کاٹنے کی رسم، بالائی برما میں ڈھالوں اور تلواروں کو بالوں سے آراستہ کرنا اور تورات میں سمسن کے بالوں کی قوت کی کہانی یہ سب اسی نیم مذہبی عقیدے کی بدلی ہوئی شکلیں ہیں جو قوتِ حیات، چاند اور انسانی کھوپری کے تعلق پر مبنی ہے۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جہاں تک مذہبی رنگ کا تعلق ہے، مادری تہذیب کی تیسری منزل میں طرح طرح کے اوہام خصوصاً فال شگون وغیرہ کے عقائد حد سے زیادہ بڑھ گئے تھے۔ اس کی وجہ زیادہ تر مردوں کی خفیہ انجمنوں کا اثر ہے۔ ابتدا میں انھیں انجمنوں نے نجات دہندہ کا بلند تصور پیدا کیا تھا لیکن آگے چل کر یہ سیاسی کلب بن کر رہ گئیں۔ یہ انجمنیں ان سب مردوں کو جو ان کے ممبر نہیں تھے اور خاص طور پر عورتوں کو طرح طرح سے دھمکاتی تھیں۔ یہاں تک کہ ساری جماعت ان کے پنجۂ ستم میں گرفتار ہوگئی۔ سچی بات یہ ہے کہ خود عورتیں بھوت پریت اور فال شگون کا ڈھکوسلا کبھی نہ کھڑا کرتیں اور مرد انھیں اس پر مجبور نہ کرتے۔

اس کے برخلاف اس منزل کے مادّی تہذیب و تمدّن میں غیر معمولی ترقی نظر آتی ہے۔ اغلب یہ ہے کہ قبل تاریخی عہد میں مادری تہذیب کی تیسری منزل پر اوہام پرستی اس قدر مسلط نہ ہوگی، جتنی

موجودہ زمانے میں پائی جاتی ہے، ورنہ یہ لوگ ہرگز اس قابل نہ ہوتے کہ اپنی تہذیب کو حیرت انگیز ترقی دے کر ہندستان میں ہنجو دارو اور ہڑپا جیسی شہری ریاستیں، کریٹ میں منوئی تہذیب اور مصر میں قبل سلاطینی تمدن پیدا کر سکیں۔ لیکن ان نفیس اور خوشنما شہروں اور محلوں کی شان و شوکت میں محو ہونے سے پہلے ہمیں اس دیہاتی تہذیب کا مطالعہ کرنا چاہیے جو مادری تہذیب کی تیسری منزل میں وجود میں آئی تھی۔

بڑے بڑے مستطیل شکل کے مکانوں، کاشتکاری کے بہتر طریقوں اور چھوٹے گھریلو جانوروں خصوصاً سور کو پالنے کی بدولت اس تہذیب کی ایک مضبوط مادی بنیاد قائم ہوگئی تھی جس پر مزید تعمیر ہو سکتی تھی۔ مشرق میں پان اور مغرب میں تمباکو کی پتی کا استعمال اور کئی قسم کی شرابوں اور نشی چیزوں کا بنانا، پہلے پہل اسی منزل میں شروع ہوا۔ کمھار چاک کی مدد سے مٹی کے برتن پہلے سے بہتر بنانے لگے اور کتائی اور بنائی میں بھی خاصی ترقی ہوئی۔ مکانوں پر آرائش کے لیے ایک خاص قسم کی شکلیں بنائی جاتی تھیں جو زرخیزی اور دولت کی علامت تھیں۔ ان میں عورتوں کی تصویریں خاص طور پر نمایاں تھیں۔ اچھی کشتیوں کے بن جانے سے پانی کے ذریعے آمد و رفت میں آسانی ہو گئی اور مثلث لکڑی کی کمانوں کی ایجاد سے تیراندازی میں زیادہ زور پیدا ہو گیا۔ اسی طرح بہتر بیلچوں کی بدولت زراعت کی پیداوار بڑھ گئی۔

معاشرت کے میدان میں وہ تخصیص جو مادری تہذیب کی دوسری

منزل میں شروع ہوگئی تھی اور بڑھتی گئی۔ ماموں کی اہمیت میں اور
بھی اضافہ ہوگیا۔ شاید یہ غیر قوموں کا اثر تھا جو پدری تہذیب کی
حامل تھیں، کہ مردوں کا باہمی ربط خفیہ انجمنوں کے اندر روز بروز بڑھتا
گیا۔ وہ اپنی ماؤں کے قبیلوں میں رہتے تھے اور بیویوں کے گھر
غیروں کی طرح کبھی کبھی چلے جاتے تھے۔ جوں جوں بچے کا تعلق
ماموں سے زیادہ سمجھا جانے لگا باپ کی اہمیت کم ہوتی گئی۔ قدرتی
بات ہے کہ ان حالات میں کنوارے لڑکے اور لڑکیوں کی وہ آزادی
جو انھیں ابتدا سے حاصل تھی، شادی کے بعد بھی قائم رہتی تھی۔
ایک عورت کا کئی مردوں سے اور ایک مرد کا کئی عورتوں سے شادی
کرنا مادری تہذیب کی تیسری منزل میں، کم و بیش عام ہوگیا۔ کچھ بے جا
نہ ہوگا اگر ہم یہاں پدری تہذیب اور مادری تہذیب کی نفسی کیفیت
کا ایک بنیادی فرق بیان کر دیں۔ مردوں کی تہذیب میں تو عورتوں
کو کسی قسم کی آزادی نہیں ملتی (جیسا کہ ہم اگلے دو بابوں میں دیکھیں گے)
لیکن عورتوں کی تہذیب کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا۔ خالص مادری
تہذیب میں (جیسے اس تہذیب کی تیسری منزل میں) جب عورتیں
اسے اپنا حق سمجھنے لگیں کہ ایک ساتھ کئی مردوں سے شادی کر سکیں
تو اسی کے ساتھ انھوں نے مردوں کو بھی یہ حق دے دیا کہ وہ کئی
عورتوں سے شادی کریں۔ یہ ملحوظ رہے کہ ہم اسے جنسی تعلقات
کا بے قید ہونا نہیں کہہ سکتے اس لیے کہ ایک کا تعلق کئی مردوں سے
یا ایک مرد کا کئی عورتوں سے باضابطہ شادی پر مبنی ہوتا تھا۔ اس بات
کا ذکر خاص طور پر کرنا ضروری ہے تاکہ انسانی تہذیب کی تاریخ کی یہ

خصوصیت نمایاں ہو جائے کہ آج تک کوئی معاشرت ایسی نہیں ہوئی جس میں شادی کا رواج نہ ہو خواہ شادی سے پہلے لڑکوں اور لڑکیوں کو کتنی ہی آزادی دی جاتی ہو، خواہ شادی کے طریقوں کے بارے میں مختلف قوموں میں کتنا ہی اختلاف ہو مگر شادی کا وجود ضرور تھا اس لیے انتہائی ارتقا پسندوں کا یہ خیال صحیح نہیں کہ شادی بعد میں ایجاد ہوئی اور ابتدائی زندگی میں مردوں اور عورتوں کے تعلقات بالکل بے قید تھے۔

موجودہ زمانے میں مادری تہذیب کی تیسری منزل جا بجا انڈونیشیا کی مخلوط آبادی میں، جو ملائی کہلاتی ہے، وسط افریقہ کے زرخیز خطے میں، ملانیشیا میں، (جہاں دوئی کا طریقہ اب تک رائج ہے) جنوبی امریکا میں خصوصاً اس کے زرخیز شمالی حصے میں جو منطقۂ حارہ میں واقع ہے پائی جاتی ہے۔ جنوبی امریکا میں سوٗر کے پالنے کا رواج نہیں لیکن اور سب خصوصیات مادری تہذیب کی تیسری منزل کی پائی جاتی ہیں، مثلاً مشترکہ خاندان، جس کی بنیاد وراثت مادری پر قائم ہے، بڑے بڑے مستطیل مکانات، آلات و اوزار اور صنعت و حرفت کی ترقیاں اور مذہبی عقائد اور توہمات۔

عام لوگوں کے لیے یہ بات دلچسپ ہوگی کہ پنج سُرے باجوں "بین کی بانسری" اور لکڑی کی گول ڈھول کو جس میں شگاف ہوتا ہے مادری تہذیب کی اونچی منزلوں سے خاص تعلق ہے۔

ابھی ہم شہری ریاستوں یا مادری تہذیب کی مکمل ترقی یافتہ صورتوں کا ذکر نہیں کریں گے، اس لیے کہ وہ ان ابتدائی تہذیبوں میں

داخل نہیں، جن سے ہمیں اس وقت سروکار ہی۔ مادری تہذیب کی شہری ریاستیں بھی اسی طرح مادری ٹوٹمی اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کے میل جول سے وجود میں آئیں جیسے پدری تہذیب کی قدیم شہری ریاستیں مثلاً روما، کارتھج، ایتھنس اور یروشلم۔ انسانی تاریخ میں تہذیب آفریں قوت کی حیثیت سے مادری تہذیب کی شہری ریاستیں پدری تہذیب کی قدیم شہری ریاستوں سے بھی زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔ جب تک وادیٔ انڈس میں مہنجو دارو اور ہڑپّا کی کھدائی سے مادری تہذیب کی عظمت و شوکت پوری طرح ظاہر نہیں ہوئی تھی اس وقت تک لوگوں کو اس اہمیت کا احساس بہت کم تھا بلکہ بالکل نہیں تھا۔ آثارِ قدیمہ کے ماہروں میں کوئی تیس سال سے یہ خیال عام تھا کہ عراق، شام، جنوبی عرب، مصر، یونان کے منوی اور اٹلی کے اٹرسکی علاقوں کی عظیم الشان تہذیب کی بنیاد، مادری تہذیب کی شہری ریاستیں تھیں۔ لیکن چونکہ ان میں سے اکثر ملکوں میں باہر سے پدری تہذیب کی حامل قوموں کی یورش نے تمدنی زندگی کے رنگ کو بدل دیا ہی اور قدیم مادری تہذیبوں کے آثار کو قریب قریب مٹا دیا ہی اس لیے عام یہ سمجھا جاتا تھا کہ ان کا روئے زمین سے معدوم ہو جانا ارتقا کا قدرتی نتیجہ ہی۔ جب وادیٔ انڈس کی قدیم تہذیب کھود کر نکالی گئی، وہ بہت سی باتوں میں موجودہ ہندستانی تہذیب سے مشابہ پائی گئی اور یہ ثابت ہوا کہ ہندستان کی قبلِ آریائی تہذیب سارے مشرقِ قریب کی تہذیب کی بنیاد ہی تو تاریخِ تمدن کے ماہروں کی آنکھیں کھلیں اور انھیں پتہ چلا کہ مادری تہذیب کی شہری ریاستیں آج تک تمدنی زندگی میں کس قدر اہمیت

رکھتی ہیں۔

خاکسار مولف کی تحقیق کا خاص موضوع یہ ہو کہ ہندستان میں جو مادری تہذیب کی حامل ترقی یافتہ قومیں مثلاً نائر، بنٹ، سنغم، ٹیا وغیرہ اب تک موجود ہیں ایک طرف ان کا ربط اور تاریخی تعلق وادیٔ سندھ اور مصر کی قدیم تہذیبوں اور یونان کی منوئی تہذیب سے دکھایا جائے اور دوسری طرف ان کی خصوصیات کا مقابلہ مادری تہذیب کے ان بچے کھچے آثار سے کیا جائے جو ہندستان، یونان، مصر اور عرب کی جدید تہذیبوں کے اندر موجود ہیں۔ اگرچہ یہاں ان مسائل پر جو تاریخ اور علم الاقوام دونوں سے تعلق رکھتے ہیں بحث کرنے کا موقع نہیں لیکن مادری تہذیب کی تینوں منزلوں کے ذکر کے سلسلے میں ان کی طرف اشارہ کر دینا ضروری تھا۔

خاتمہ

پچھلے باب میں انسانی تہذیب کے سب سے پہلے دَور کا جس کا کہ ہمیں علم ہو یعنی اوّلیں یا "اصلی" تہذیب کا ذکر تفصیل سے ہو چکا ہو۔ یہی وہ جڑ ہو جس سے انسانی تہذیب کی تینوں ابتدائی شاخیں نکلی ہوں گی۔

ان تینوں ابتدائی شاخوں کے باہم ملنے اور ایک دوسرے پر اثر ڈالنے سے "ثانوی" یا "تکمل" تہذیبیں پیدا ہوئیں جن کا ذکر فنِ تاریخ کا موضوع ہو اس لیے کہ ان ثانوی تہذیبوں کے حامل ہمیشہ سے لکھنا پڑھنا جانتے تھے اور خود ان کا لکھا ہوا تحریری رکارڈ

موجود ہی۔ لیکن یہ تحریریں بعض اوقات پڑھنے میں نہیں آتیں (مثلاً مہنجوداڑو کے کتبے)، یا ان سے زیر بحث تہذیب کے مادّی، معاشرتی اور مذہبی پہلوؤں کے متعلق کافی شہادت نہیں ملتی۔ اس لیے علم الاقوام کی تحقیقات اور تاریخِ تمدّن کی معلومات کے مقابلے سے "مکمل تہذیب" کی حامل قوموں پر بھی بہت کچھ روشنی پڑتی ہی۔ یہ بات سبھی قوموں پر صادق آتی ہی اور خصوصاً ہندستان کی قوموں پر جن کے ہاں تہذیبی روایات اتنے عرصے سے موجود ہیں کہ شاید دُنیا میں کہیں نہیں ہوں گی۔ اور ان روایات میں مادری تہذیب کا رنگ غالب ہی۔ ہندستان کی تاریخ کا مطالعہ کرنے والے کو یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ یہ شاندار روایات ہندستان کی قبل آریائی تہذیب کا سلسلہ مشرقِ قریب کی عظیم الشان قدیم تہذیبوں سے ملاتی ہیں۔

مادری تہذیب کی بنیاد اولیں تہذیب پر قائم ہوئی۔ اغلب یہ ہی کہ اوّلیں تہذیب کے وسطی حلقے یعنی بونوں کی جماعت نے آگے چل کر مادری تہذیب کو نشو ونما دی ہوگی۔ وراثت پدری اور وراثت مادری دونوں کا رواج، عورتوں مردوں کی مساوات، دولھا کا اکثر دُلھن کے گھر جاکر رہنا اور مُردوں کی کھوپری کا احترام، ان سب چیزوں کو اس ارتقا کا پہلا قدم سمجھنا چاہیے جس کی تکمیل مادری تہذیب کی شکل میں ہوئی۔ لیکن مادری تہذیب کی اصل محرک زراعت کی ایجاد ہوئی ہوگی۔ یہ تمدّنی ارتقا کا بہت بڑا قدم تھا جو غالباً عورتوں نے اٹھایا۔ مادرانہ شفقت ان کی جبلت میں تھی اور غذا کے لیے

نباتات مہیّا کرنے کی خدمت وہ ابتدا سے انجام دیتی چلی آئی تھیں اس لیے یہ زبردست کارنامہ انھیں کے حصے میں آیا۔ مرد اپنی تشدّد پسندی اور تخریبی طبیعت کے طفیل میں اوّلیں تہذیب کے زمانے ہی سے جانوروں کا شکار کرتے تھے۔ اب بھی وہی کرتے رہے۔ یہ مادری تہذیب، زراعت اور حضری زندگی کی برکت ہے کہ انھیں آگے چل کر بلند تر مقاصد کی طرف توجہ ہوئی۔ اس کا ثبوت وہ عظیم الشان روحانی تصوّرات ہیں جو مادری تہذیب میں مردوں کی خفیہ انجمنوں نے قائم کیے۔

واقعات کا یہ سلسلہ مادری تہذیب کی تینوں منزلوں میں دکھایا جا سکتا ہے۔

پہلی منزل میں عورتوں کا صرف ایک ہی شغل نظر آتا ہے اور وہ ابتدائی طریقے کی زراعت ہے۔ مستطیل مکان، شادی کے بعد دولھا کا دُلھن کے گھر رہنا اور دیوی کے ساتھ ساتھ چاند کے اوتار کی اہمیت کا بڑھنا، مادری تہذیب کی پہلی منزل کی سب سے نمایاں خصوصیات ہیں۔ دوسری منزل سے بظاہر مادری تہذیب کی حامل قومیں سب کی سب نہیں گزریں۔ دوئی کا مخصوص طریقہ (جس کا سلسلہ چاند کی دیومالا سے ملتا ہے) اس منزل کی سب سے واضح علامت ہے۔ اس کے علاوہ پہلی منزل کے مختلف مظاہر میں اب شدّت اور تخصیص کا رجحان پیدا ہو گیا۔ زراعت بہتر طریقے سے ہونے لگی لیکن ابھی تک چھوٹے پالتو جانوروں سے کام لینا شروع نہیں ہوا۔ معاشرت کے میدان میں ماموں کی اہمیت بڑھ گئی اور باپ کی کم ہو گئی۔

مردوں کی خفیہ انجمنیں زیادہ طاقتور ہوگئیں اور اب ان میں وہ روحانیت نہیں رہی جس کی بدولت ان کے تخیل نے چاند کے اوتار کی کہانیاں ترتیب دی تھیں۔ ان انجمنوں کا سیاسی مقصد روز بروز نمایاں ہوتا گیا۔ لوگوں پر رعب ڈالنے کا ایک ذریعہ بھوتوں اور راکھشسوں کے چہرے تھے جنھیں لگا کر ان انجمنوں کے ممبر ناواقفوں، خصوصاً عورتوں کو ڈراتے تھے۔ بعض صورتوں میں تو ان انجمنوں کی تخویفی حکومت نے مادری تہذیب میں عورتوں کے بلند مرتبے کو پست کر دیا۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی محرمی کی رسمیں جو اولیں تہذیب میں ساتھ ساتھ ادا ہوتی تھیں ارتقا کی اس منزل میں الگ ہو گئیں۔ لڑکیوں کی محرمی کی رسم ان کی پہلی ماہواری کے وقت ادا ہونے لگی اور لڑکوں کی اس وقت جب وہ خفیہ انجمنوں کے ممبر بنائے جاتے تھے۔

دوسری منزل میں مذہب میں صریحی طور پر نجات دہندہ کے بلند تصوّر کی غلط تعبیر نظر آتی ہے جو چاند کی شکل میں تہذیب، زندگی اور حیات اور ممات کا پیام لانے والا سمجھا جاتا تھا۔ غلط تعبیر یہ تھی کہ چاند کے افسانے کی نقل میں ساحرانہ رسمیں ادا کرنے سے قوتِ حیات اور زرخیزی حاصل ہو سکتی ہے۔ انسانی قربانی اور سر کاٹنے کا خبط یہیں سے شروع ہوا ہوگا۔

مادری تہذیب کے ارتقا کی تیسری منزل کو ہم دو درجوں میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ پہلا درجہ کم و بیش دوسری منزل کے برابر ہے۔ مگر اس میں دوئی کا طریقہ موجود نہیں ہے۔ دوسرا درجہ شہری ریاستوں کی مکمل تہذیب کے لگ بھگ ہے۔ مگر اس تقسیم سے شاید ہمارا نظری خاکہ

منفرد مثالوں پر پورا نہ اتر سکے اس لیے ہم نے تیسری منزل کے بیان کو صرف سادہ دیہاتی تہذیب تک محدود رکھا ہے۔ اس سب سے نمایاں خصوصیت چھوٹے جانوروں خصوصاً سؤر کو پالنا ہے۔ مشترکہ خاندان جس میں وراثت مادری کا طریقہ رائج ہے، مستطیل شکل کے بڑے بڑے مکانوں میں جیسے کسانوں کے ہوتے ہیں رہا کرتا ہے۔ کمہار کا چاک، کتائی اور بنائی کا بہتر طریقہ غرض جمہوری طرز کی تقسیم کا مختلف اصول جو غلامی اور استبداد سے پاک ہے۔ لوگوں کو اس کا موقع دیتا ہے کہ بہت بڑی تعداد میں اکٹھے ہو کر امن و امان سے رہ سکیں۔ بڑے بڑے دریاؤں مثلاً ہوانگ ہو، میکانگ، برہم پتر گنگا، سندھ، نیل اور کسی حد تک ڈینوب کے کنارے عہدِ متاخر حجری، میں پہلی بڑی بستیاں آباد ہوئیں جو مادری تہذیب کی اس تیسری منزل سے تعلق رکھتی تھیں۔ یہاں شادی کا یہی طریقہ نمایاں تھا کہ دُلھن اپنی ماں کے گھر رہتی تھی اور دُولھا یا تو کبھی کبھی اس کے پاس آتا تھا یا آکر وہیں رہنے لگتا تھا۔ اگلے بابوں میں ہم یہ بتائیں گے کہ کس طرح بیرونی پدری تہذیب کے اثر سے شادی کا یہ طریقہ بدلا اور مادری تہذیب پدری تہذیب کا رنگ اختیار کرنے لگی۔ لڑکیاں، ان کی مائیں یہاں تک کہ ان کے باپ بھی اس تبدیلی کے مخالف تھے۔ جو دُولھا اپنی دُلھنوں کو لے جانا چاہتے تھے انھیں برسوں کوشش کرنی پڑتی تھی۔ شادی کا یہ طریقہ قدیم عبرانیوں تک میں جو پدری تہذیب کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے باقی تھا۔ یہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ لوگوں کے جذبات کس قدر شدت

سے اسے بدلنے کے خلاف تھے۔ اس کی ایک اور مثال ہندستان کے بعض حصوں میں راجپوتوں کے ہاں شادی کی رسموں میں نظر آتی ہے۔[۵۹] اس مسئلے کا ایک حل یہ تھا کہ دُولھا دُولھن اپنے اپنے خاندان میں رہیں اور کبھی کبھی ایک دوسرے کے ہاں چلے جائیں۔ ظاہر ہے کہ اس معاشرت میں ایک عورت کا کئی مردوں سے شادی کرنا کثرت سے رائج تھا خصوصاً مشرقِ قریب میں جہاں تک کہ پُرانی کہانیوں کی شہادت سے پتہ چلتا ہے۔

جہاں تک مذہب کا تعلق ہے تیسری منزل کے کم سے کم ابتدائی درجے میں دوسری منزل کے مقابلے میں کوئی بنیادی فرق نہیں پایا جاتا۔ آگے چل کر مادری تہذیب کی شہری ریاستوں کے قائم ہونے تک مذہب میں جو جدتیں اور تبدیلیاں ہوئیں ان کا ذکر اس کتاب کے دوسرے حصے میں سندھ کی تہذیب کے سلسلے میں کیا جائے گا۔ البتہ اتنا ہم اب بھی کہہ سکتے ہیں کہ شیو شکتی کا عقیدہ اُسی اوتار کے تصور کی ایک نئی شکل ہے جو تہذیب کا پیامبر اور چاند سے تعلق رکھنے والا سمجھا جاتا تھا۔

ہم مادری تہذیب کی ہر منزل کے جغرافی حدود الگ الگ نہیں بتا سکتے اس لیے کہ ان منزلوں کی حدِ فاصل بہت دُھندلی ہے۔ البتہ ان خاص خاص قوموں کا جو مادری تہذیب کی حامل تھیں اور ان کے جغرافی مقاموں کا مختصر ذکر یہاں بے محل نہ ہوگا۔

ہندستان غالباً سب سے پہلی مادری تہذیب کا مرکز اور مبداء تھا۔ مادری تہذیب کی پہلی منزل کے آثار جنوبی ہند کی جنگلی قوموں

ہیں، دوسری منزل کے آثار اسی خطّے کے زراعتی اور صنعتی طبقوں ہیں اور مہنجو دارو اور ہڑپّا کے نمونے کی مادری تہذیب کی حامل شہری ریاستوں کے باقیات نائرذات اور دوسری ذاتوں میں پائے جاتے ہیں۔ آسام کی کھاسی اور گیرد قوموں نے اپنی تہذیب کو دوسری منزل سے ترقی دے کر موجودہ حیثیت کو پہنچایا جس میں ہندو تہذیب کا رنگ غالب ہے۔

جنوب مشرقی ایشیا کی مختلف ریاستوں اور آسٹریلوی ایشائی قبیلوں خصوصاً موئی، مان کھر اور کمبوڈیا کے چام قبائل میں مادری تہذیب رائج تھی اور وہ زیادہ تر تیسری منزل سے تعلق رکھتی تھی۔لیکن تھائی قوم جس نے تیرھویں صدی عیسوی میں چین سے حملہ کیا، معاشرتی تنظیم کے لحاظ سے پدری تہذیب کی حامل تھی۔ یہ لوگ شان ریاستوں ٹانکن، سیام اور آسام کے ایک حصے پر چھاگئے۔ البتہ انام کے پہاڑوں میں مادری تہذیب اب تک باقی ہے اور مذہبِ اسلام اور عرب تہذیب کے ساتھ مل کر اس نے ایک خاص صورت اختیار کرلی ہے۔

اسی طرح چین کی تہذیب قطعی طور پر مادری تہذیب پر مبنی تھی لیکن وسطِ ایشیا کے خانہ بدوش گلہ بان جو پدری تہذیب کے حامل تھے اس پر متواتر حملے کرتے رہے اور ان کے اثر سے اُس میں بار بار تبدیلیاں ہوئیں۔ خصوصاً چو خاندان کے عہدِ حکومت میں۔

تبت کی قومی تہذیب بھی ان کسانوں سے شروع ہوئی جو مادری تہذیب کی تیسری منزل سے تعلق رکھتے تھے۔ چھٹی صدی عیسوی

میں لاماؤں کی پہلی جماعت بون پو نے ایک ایسی تہذیب کی بنا ڈالی
جس پر پدری تہذیب کا رنگ غالب تھا۔

وسطی اور شمالی ایشیا میں جو خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کا
اصلی گھر تھا اس کے آثار پائے جاتے ہیں، خصوصاً ترکی قبائل کی
دیو مالا اور مذہب میں اور مغل قوموں کی معاشرتی زندگی میں کہ یہاں
مادری تہذیب کے حامل باہر سے آئے تھے۔ مادری تہذیب کے
اثرات کی ایک لہر جو عہد متاخر حجری میں چین سے اٹھی تھی، غالباً شمال
مشرقی ایشیا، کمبوڈیا کے ابتدائی قبائل اور شمال مشرقی امریکہ کی اسکیمو
قوم میں پہنچے ہوں گے۔ ان اثرات کے بغیر یہ قومیں آج تک خالص
اوّلیں تہذیب کا نمونہ رہتیں۔ "بڑے کوے کی پرستش" جو آبنائے بیرنگ
کے راستے سے شمال مغربی امریکہ کی اسکیمو قوم تک پہنچ گئی تھی صاف
طور پر شمال مشرقی ایشیا کی مادری تہذیب کا ایک جُز ہے۔

جاپان میں مادری تہذیب کا عنصر اماترا تسو دیوی کی پرستش میں
واضح طور پر نظر آتا ہے۔ آج تک جاپانی لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ شاہی خاندان
اسی دیوی کی نسل سے ہے اور اُسی کی بدولت اس خانداں کو شِنتو
جماعت کی مذہبی اور سیاسی قیادت حاصل ہے۔

انڈونیشیا میں مادری تہذیب کے بچے کھچے مرکز سماترا کے مینانگ
کباؤ ربانک قبائل پدری تہذیب کے حامل ہیں مگر ان کے ہاں مادری
تہذیب کی بھی بہت سی روایات موجود ہیں) اور بورنیو کے ڈائک
ہیں جو زیادہ تر اس جزیرے کے مغربی حصّے میں رہتے ہیں۔ انڈونیشیا
کے مشرقی جزائر خصوصاً ٹورادیا میں مادری تہذیب کے زیادہ عناصر

باقی ہیں۔ بخلاف اس کے جاوا میں صرف کہانیوں سے اس کا پتہ چلتا ہو کہ اگلے زمانے میں یہاں مادری تہذیب رائج تھی۔ شادی کے بعد لڑکی کا ماں کے گھر رہنا اور مادری تہذیب کے بعض اور عناصر سماترا کے جنوب میں چھوٹے چھوٹے جزیروں مثلاً انگانو اور منتاوی میں پائے جاتے ہیں۔ اس تہذیب کی بعض روایات نیاس اور اس سے بھی زیادہ نکوبار جزائر میں اور کچھ آثار جزائر انڈمان میں بھی موجود ہیں۔

جزائر فلپائن اور فارموسا میں مادری تہذیب کے زیادہ آثار موجود ہیں۔ لیکن ملانیشیا میں ان سے بھی زیادہ ہیں۔ وہاں اس تہذیب کی دوسری منزل ٹوٹمی تصورات کے ساتھ رل مل گئی ہو۔ نیو ہیبرڈیس، سینٹ کروز اور فیجی اس نمونے کی تہذیب کے مرکز سمجھے جا سکتے ہیں۔ پولی نیشیا میں دوئی کا طریقہ سب سے واضح طور پر جزائر مارکوئیاس میں نظر آتا ہو۔ یہ دلچسپ بات ہو کہ صرف دوئی کے طریقے کو بغیر مادری تہذیب کے دوسرے عناصر کے، وسطِ ایشیا کے قبائل مثلاً ترکوں نے لے لیا تھا، قبل اس کے کہ وہ مشرقِ قریب میں پہنچیں اور مذہب اسلام کو اختیار کریں۔

آسٹریلیا میں مادری تہذیب کے منفرد عناصر تو پائے جاتے ہیں لیکن پوری مادری تہذیب کہیں نظر نہیں آتی۔ ماموں کی اہمیت، شادی کے بعد لڑکی کا ماں کے گھر رہنا اور زراعت (جس سے آسٹریلیا کے لوگ بالکل ناواقف تھے) یہ چیزیں آسٹریلیا کے اصلی باشندوں کے ہاں موجود نہ تھیں حالانکہ ان کی زندگی مادری تہذیب پر مبنی تھی۔ البتہ ٹوٹم کا فرضی رشتہ جو عموماً باپ کی طرف سے شمار کیا جاتا ہو۔ آسٹریلیا

اور ملانیشیا میں ماں کی طرف سے شمار ہوتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک منفرد عنصر ہے جو بیرونی تہذیبوں سے لیا گیا ہے۔ دوئی کے طریقے کو وسعت دے کر یہاں سماج کو چار بلکہ آٹھ طبقوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔

افریقہ میں مادری شہری تہذیب کا سب سے بڑا مرکز بلاشبہ مصر تھا، لیکن مغربی افریقہ (دہوم، بنین، اشانتے اور شمال میں توارگ یا تماشگ) بھی تیسری منزل کی قدیم ترقی یافتہ مادری تہذیب کے اہم مرکز ہیں۔ یہ بات مسلم ہے کہ کم سے کم شمالی افریقہ اور مصر کی تہذیب کا تعلق ایک طرف بحیرۂ روم کے ساحل اور مشرقِ قریب کے علاقوں اور دوسری طرف جنوبی عرب اور وادیٔ سندھ کی تہذیب سے تھا۔ مغربی افریقہ کی مادری تہذیب کی ریاستوں میں جو شاید سمبابو اور مانومٹاپا کے محل وقوع میں آباد تھیں، ایک ترقی یافتہ تہذیب موجود تھی۔ اور غالباً لوہے کی دریافت اور اس سے آلات واوزار بنانے کا سہرا انھیں کے سر ہے۔ بنٹو قبائل سوڈانی، نلوی اور اماہری قوموں میں اب تک مادری تہذیب کا رنگ موجود ہے یا ان کی روایات اور معاشرت میں اس کے آثار پائے جاتے ہیں۔

یورپ میں عہدِ حجری کے ختم بلکہ عہد متاخر حجری تک جب کہ زراعتی تمدن کا فروغ تھا۔ تہذیب کے اعلیٰ عناصر کو مادری تہذیب کی حامل قومیں اپنے ساتھ لائی تھیں۔ ان کا مرکز ایشیائے کوچک میں کوہِ طور کے علاقے کی تہذیب تھی جو یقیناً وادیٔ سندھ کی تہذیب سے کچھ رشتہ رکھتی تھی۔ اس تہذیبی ارتقا کا انتہائی نقطۂ عروج کریٹ کی منوئی تہذیب اور قدیم یونان کی دوسری تہذیبیں تھیں۔

مغربی یورپ میں آئی بیری ، باسک اور کلٹ قوموں اور ایک حد تک یورپ کی ٹیوٹانی اور سلانی قوموں میں مادری تہذیب کے متعدد عناصر موجود ہیں جن کا سلسلہ علاقہ طور کی تہذیب اور کوہ قاف کی یفیٹی تہذیب سے ملتا ہے۔ اٹلی میں رومی عہد سے قبل اس تہذیب کی حامل اٹرسکی اور ایلیمی قومیں تھیں۔ رومی عہد کی تہذیب بہت کچھ انہی سے ماخوذ تھی۔

شمالی امریکہ میں مادری تہذیب کے تین بڑے مرکز ہیں:۔

(الف) مشرق کا مرکز جہاں زراعت نے بہت ترقی کی تھی اور مکئی کی کاشت ہوتی تھی۔ ایروکواس اور مسکوگی قوموں نے ایک ترقی یافتہ ثانوی بلکہ اس سے بھی برتر تہذیب پیدا کرلی تھی۔ دوئی کا طریقہ ان دونوں کے ہاں موجود تھا لیکن ایروکواس قوام میں اسے مادری تہذیب سے کوئی تعلق نہیں تھا بلکہ اس نے اسے اپنے ہمسایوں سے جو پدری تہذیب کے حامل تھے حاصل کیا تھا۔ ناچیل یعنی مسکوگی قوم کی حکمراں جماعت، امریکہ کے اصلی باشندوں کی ایک جماعت ہے جس کی بہت سی خصوصیات ملابار کی نائر قوم سے ملتی جلتی ہیں۔

(ب) جنوب مغربی امریکہ میں ہاپی اور سونی پیوبلو قوموں میں اب تک مادری تہذیب کی ابتدائی شکل موجود ہے جو دوئی کے ایک دیسی طریقے پر مبنی ہے۔

(ج) شمال مغرب میں ٹلنگٹ، ہیڈا، زمشین اور ایک حد تک کواکیوٹل قوم (اگرچہ وہ اب پدری تہذیب کی حامل ہے) مادری

تہذیب کی نمائندہ تھی
وسطی امریکہ میں مایا کی شہری تہذیب میں مادری تہذیب کا اصلی رنگ صاف پہچانا جا سکتا ہے۔
جنوبی امریکہ میں یہی صورتِ حال انڈیس کے علاقے میں نظر آتی ہے اور وہاں چیچا اسی طرح مادری تہذیب کی حکمراں جماعت ہے، جیسے شمالی امریکہ میں وادیٔ میسیسپی کی ناچ قوم یا جنوبِ مغربی ہندستان کی نائر قوم۔ وادیٔ امازوناس کے جنگلی علاقے میں اراوک مادری تہذیب کا ایک اور مرکز ہے۔
اس موضوع پر کتابیں اتنی کثرت سے موجود ہیں کہ اگر ان کے مصنّفوں کی فہرست دی جائے تو ان سب لوگوں کے نام آجائیں گے جنھوں نے علم الاقوام پر کچھ لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہم دوسرے باب میں تاریخ علم الاقوام کے سلسلے میں ان مؤرخوں وغیرہ کے نام دے چکے ہیں جنھوں نے مادری تہذیب کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی تھی۔ اس لیے صرف چند اشخاص کا نام دے دینا کافی ہوگا جو ہندستان کے نقطۂ نظر سے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔
لافیتو، اِنسلین، باخوفن، مارگن اور گراس ان لوگوں میں سے تھے جنھوں نے ہمیں سب سے پہلے مادری تہذیب کے وجود اور اس کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی۔ فرِتس گریبنر نے مشرقی پاپوا کے وراثت مادری کے حلقے کا خاکہ پیش کیا۔ اِشمٹ، کوپرس اور ہائینے گیلڈرن نے مادری تہذیب کا زیادہ واضح اور نہایت وسیع نقشہ کھینچا۔ مس ہیرین، نیلامسن اور کورینمان نے مادری تہذیب کے

اس رشتے کی طرف اشارہ کیا جو یونان کی منوئی قوم اور مشرقِ قدیم
میں تھا اور جس کے متعلق مصریات کی کُل کتابوں سے ہمیں مزید معلومات
حاصل ہوتی ہیں۔ مالینا ؤسکی نے علم الاقوام میں تحلیل اور مشاہدے کے
وظائفی طریقے سے کام لے کر اس بات کے صحیح اندازے میں مدد
دی کہ مادری تہذیب اپنی ساخت کے لحاظ سے جُداگانہ حیثیت رکھتی
ہے۔ اس نے ملانیشیا کے جزائر ٹوبریانڈ میں جو عملی تحقیقات کی اس سے
مادری تہذیب کی خصوصیات کے علمی نظریے کو بہت تقویت پہنچی۔
مارشل نے وادی سندھ کی تہذیب پر جو زبردست کتاب لکھی ہے وہ
ہندستان کی مادری تہذیب کی تاریخ پر روشنی ڈالتی ہے۔ برفالٹ کی
ضخیم تالیف میں بہت کچھ مفید معلومات اور دُنیا کے ہر حصّے میں
مادری تہذیب کی مثالیں ملتی ہیں اور بہت سے دلچسپ مسائل نظر
کے سامنے آجاتے ہیں۔

چھٹا باب

ٹوٹمی تہذیب

ہم نے وراثتِ مادری اور تہذیبِ مادری میں فرق کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ صرف ماں سے بیٹی کو ترکہ پہنچنے کا رواج کسی قوم کو تہذیبِ مادری کے دائرے میں شامل کر دینے کے لیے کافی نہیں۔ اسی طرح ہمیں یہ بھی ملحوظ رکھنا چاہیے کہ محض ٹوٹم کا عقیدہ یا کسی قبیلے کا ٹوٹم کے اعتبار سے مختلف جرگوں میں تقسیم ہونا لازمی طور پر اس امر پر دلالت نہیں کرتا کہ وہ قبیلہ ٹوٹمی تہذیب کا حامل ہے۔

لفظ ٹوٹم شمالی امریکہ کی اوجیبوی (الگونکن) زبان کے لفظ "ٹوڈیمن" سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں وہ جانور جس سے کوئی جرگہ منسوب ہو۔ جرگے اور جانور کا تعلق کسی افسانوی رشتے پر مبنی ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس جرگے کے مورثِ اعلیٰ یا تو خود جانور تھے یا کسی جانور کے قریبی رشتے دار تھے۔ اکثر یہ مورث کسی خاص جانور کے حقیقی رشتے کے بھائی یا مصیبت میں ایک دوسرے کے کام آنے والے دوست سمجھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ انسان کا حیوانات یا نباتات یا جمادات سے یہ رشتہ محض خیالی ہے۔ اسی طرح ایک ٹوٹمی جرگے کے سب لوگوں میں آپس میں خون کا رشتہ ہونا بھی

محض خیال ہی خیال ہے۔ قریب قریب کُل ٹوٹمی قبائل کی یہ خصوصیت ہے کہ ایک ہی جرگے کے لوگوں کو کسی صورت میں بھی آپس میں شادی کرنے کی اجازت نہیں۔ وہ اس پر مجبور ہیں کہ کسی دوسرے جرگے میں شادی کریں۔ یہ بیرونی شادی کا دستور کہلاتا ہے اس کے برعکس ہندستان کی مختلف ذاتوں میں عموماً اندرونی شادی کا دستور رائج ہے یعنی ہر شخص کو اپنی ہی جماعت میں شادی کرنی پڑتی ہے۔ وسط ہند اور دکن میں بہت سے ٹوٹمی قبائل پر برہمنوں کے اثر سے ہندو مذہب کا رنگ چھا گیا۔ انھوں نے بیرونی شادی کا دستور تو قائم رکھا لیکن مختلف جرگے مل کر ایک ہی ذات بن گئے۔ سنتال، کارکو، منڈا اور تلنگی علاقے کے کسانوں اور کاری گروں کی اکثر ذاتیں اس کی مثال ہیں۔

غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ قومیں یا قبیلے جن میں بیرونی شادی کا دستور ہے اور جن کی تقسیم کسی ٹوٹم سے خیالی رشتے کی بنا پر کی گئی ہے۔ اپنی ایک مخصوص تہذیب رکھتے ہیں۔ معاشرت میں وراثتِ پدری کا طریقہ، معاشی زندگی میں شکار کی اہمیت اور مذہب میں سورج کی پرستش، ٹوٹمی تہذیبی دائرے کے عناصر ہیں۔

جس طرح ہمارا یہ خیال ہے کہ ایک جگہ (شاید ہندستان میں) ایک زمانہ میں اولیں تہذیب کی عورتوں نے جو غذا کے لیے نباتات جمع کیا کرتی تھیں، ترقی کرتے کرتے زراعت کا زبردست فن ایجاد کیا اور اپنے اس کارنامے کے ذریعے سے زراعتی مادری تہذیب کی بنا ڈالی اسی طرح ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اُسی زمانے میں کسی دوسری جگہ

ہور

(شاید ہندستان کے شمال مشرق میں) مردوں نے شکار کے فن کو ترقی دے کر عورتوں پر فوقیت حاصل کرلی۔

اس لیے ٹوٹمی تہذیب مادری تہذیب کی بہن سمجھی جاتی ہے۔ دونوں کی اصل ایک ہی ہے یعنی اوّلیں تہذیب، لیکن ان کی نشوونما کا رُخ الگ الگ ہے۔ ٹوٹمی تہذیب کی یہ خصوصیت کہ اس میں پدری وراثت کا طریقہ رائج ہے اور مرد عورتوں پر غالب ہیں، ایک تیسری تہذیب میں یعنی خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں بھی موجود ہے جو اُسی مشترک اصل سے پیدا ہوئی تھی۔ اس کا ذکر ہم اگلے باب میں کریں گے۔ لیکن جہاں مادری تہذیب اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب نے ان ترقیوں کی بنیاد رکھی جن کے بغیر اعلیٰ تہذیب کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا تھا وہاں ٹوٹمی تہذیب کا انسان کی مادی معاشرتی اور مذہبی ترقی میں بہت کم حصّہ ہے۔ ٹوٹمی قوموں نے شکار کے فن میں جو اصلاح کی اس سے انسانی تمدّن کو کچھ زیادہ فائدہ نہیں پہنچا۔ البتہ تقسیمِ محنت کے اصول نے جو ٹوٹمی جرگوں کی تقسیم اور ان کے ہاں بعض مخصوص جانوروں کے شکار کی ممانعت پر مبنی تھا، اس وقت خاصی اہمیت حاصل کرلی۔ جب ٹوٹمی تصوّرات کے ساتھ مادری تہذیب کے اصول شامل ہو گئے۔ اسی طرح ٹوٹم کے رشتے کا فرضی تصوّر بجائے خود محض ایک گورکھ دھندا تھا جس سے انسانی تمدّن کو کوئی خاص مدد نہیں ملی، لیکن مردوں کے تخیّل کی یہ بلند پروازی (جس کا ان شکاری قوموں کا ٹوٹم کا نظریہ ایک نمونہ ہے) ٹوٹمی بدوش گلہ بانوں کے شاندار تخیلات کے ساتھ مل کر مزید تہذیبی

ترقیوں کی محرک ہوئی۔ اگر سورج کی پرستش کا تصوّر واقعی ٹوٹمی تہذیب سے نکلا (جو ہم ابھی تک وثوق کے ساتھ نہیں کہہ سکتے) تو یہ اس تہذیب کا سب سے بڑا کارنامہ اور سب سے اہم اضافہ ہے جو اس نے انسانی تمدّن میں کیا۔

ایسی صورت میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ان تین ابتدائی تہذیبوں میں جو ایک ہی سرچشمے یعنی اوّلیں تہذیب سے نکلی ہیں، ٹوٹمی تہذیب اپنی ہیئت اصلی کو سب سے کم قائم رکھ سکی۔ تمام دُنیا میں اکثر ٹوٹمی قبائل نے کم سے کم زراعت کا فن، برتن بنانا اور کپڑے بُننا، مادری تہذیب سے لے کر اپنا لیا۔ کہیں کہیں نسلِ مادری اور وراثتِ مادری کا اصول بھی، کم سے کم ٹوٹمی رشتے کے بارے میں اختیار کر لیا گیا۔ البتہ مادّی املاک کے بارے میں اس کی مثالیں بہت کم ہیں کہ مردوں نے وراثتِ مادری کے اصول کے مطابق عورتوں کو ترجیح دی ہو۔ ٹوٹمی تہذیب کا ربط خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کے ساتھ اس قدر عام نہیں تھا جتنا مادری تہذیب کے ساتھ۔ پھر بھی ہم آگے چل کر دیکھیں گے کہ کس طرح ٹوٹمی تہذیب کا فرضی رشتے داری اور تقسیمِ محنت کا اصول، ان ریاستوں میں جہاں مخلوط تہذیب رائج تھی، پیشہ ور جماعتوں یا ذاتوں کے قیام کا محرک ہوا۔ ہندستان کے ذات پات کے نظام میں ٹوٹمی عنصر کی جو اہمیت ہے اس کی طرف نِگمائر نے توجّہ دلائی ہے۔[۱۱]

ہر ایک انسان کا جداگانہ تعلق کسی ایک جانور یا ایک قسم کے سب جانوروں سے ٹوٹمی تصوّر کی ایک مخصوص شکل ہے۔ امریکا کے مشہور

ماہر علم الاقوام کی یہ رائے ہے کہ انفرادی ٹوٹم کا یہ تصور اور (جانوروں کی شکل کی) ہمزاد روحوں کا عقیدہ اصلی ٹوٹمی معاشرت کا پہلا قدم ہے، اور ٹوٹمی جرگوں کی بنیاد اس طرح پڑی ہوگی کہ ایک خاص فرد جس ٹوٹم کو مانتا تھا اس کی اولاد بھی اسی کو ماننے لگی۔ یہ نظریہ بظاہر تشفی بخش ہے مگر اس پر ایک بڑا اعتراض وارد ہوتا ہے۔ انسان اور جانور کے انفرادی تعلّق کا تصور تو ہمیشہ مذہبی ہُوا کرتا ہے۔ لیکن ٹوٹمی جرگوں کا تصور ٹوٹم کے مذہبی احترام پر نہیں بلکہ انسانوں اور جانوروں کی فرضی دوستی یا رفاقت یا جنسی تعلقات پر مبنی ہوتا ہے۔ تمدّنی نفسیات کا یہ قاعدہ کلّیہ ہے کہ کُل انسانی روایات میں مذہبی روایات سب سے زیادہ دیرپا اور زمانہ کے تغیّرات سے محفوظ رہنے والی ہوتی ہیں۔ اس لیے اگر ٹوٹمی جرگوں کا نظام مذہبی رنگ کے انفرادی ٹوٹمی تصوّر سے نکلا ہوتا تو غالباً اب بھی ٹوٹم کا مذہبی احترام بدستور باقی ہوتا۔

جنوب مشرقی آسٹریلیا کی کرنائی اور کُلین قوم کے جنسی ٹوٹمی تصوّر میں، جس کا ذکر اوّلیں تہذیب کے باب میں کر چکے ہیں، ٹوٹمی تہذیب کی کوئی بات بھی پائی نہیں جاتی۔ ان کے ہاں نہ تو اشتراکِ نسل کا تصوّر موجود ہے اور نہ بیرونی شادی کا طریقہ۔ صرف اتنی بات ہے کہ ایک قبیلے کی عورتیں جانوروں خصوصاً چھوٹے پرندوں کی ایک خاص قسم سے مانوس ہوتی ہیں اور مرد ایک دوسری قسم سے۔ لیکن اصلی ٹوٹمی تہذیب کے حالوں میں نہ صرف ہر شخص اپنے ٹوٹم جانور کو نقصان پہنچانے مار ڈالنے یا کھانے سے باز رہتا ہے بلکہ بیوی میاں کے اور میاں بیوی کے ٹوٹم کی بھی کم و بیش عزّت کرتا ہے لیکن آسٹریلیا کے جنسی ٹوٹم

والوں کے ہاں معاملہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ عورت مرد ایک دوسرے کے ٹوٹمی پرند کا شکار کرتے ہیں اور اس سے ان میں آپس میں بدمزگی ہو جاتی ہے۔ مردوں اور عورتوں کے جھگڑے جو اس بنا پر عموماً ہوتے رہتے ہیں کچھ زیادہ اہم نہیں سمجھے جاتے بلکہ عموماً اس سلسلے میں ان کی منگنی اور شادی ہو جاتی ہے۔

اصلی ٹوٹم یا جرگوں کے ٹوٹم کی بھی بہت سی قسمیں ہیں۔ کہیں ٹوٹم کوئی جانور ہوتا ہے کہیں کوئی پودا اور کہیں کوئی بے جان چیز۔ جزوی ٹوٹم اسے کہتے ہیں کہ انسان کا رشتہ جانور کے جسم کے صرف ایک حصے مثلاً بھینس کے سینگ یا گلہری کی دُم سے سمجھا جاتا ہے۔ تفریقی ٹوٹم سے مراد ہے کسی نوع کے وہ جانور جو ایک خاص صفت رکھتے ہوں (مثلاً کالے کوّے یا لال بلیّاں)۔ مربوط ٹوٹم مختلف جانوروں کے سلسلے کا نام ہے جن میں باہم کوئی خاص تعلّق ہو، یہ تعلق کچھ ضروری نہیں کہ قدرتی ہو بلکہ صرف افسانوی تعلّق کافی ہے (مثلاً ریچھ اور ہاتھی جو کسی کہانی کی رو سے ایک دوسرے کے رشتے کے بھائی سمجھے جاتے ہیں۔

یہ خیال کہ انسان جانور سے پیدا ہوئے ہیں (اور لوٹ کر اسی میں مل جائیں گے) سب ٹوٹمی تہذیبوں میں عام ہے۔ شکاری مردوں کی ساری توجہ جانوروں کی زندگی اور ان کی عادتوں کی طرف ہوتی ہے، اس لیے ٹوٹمی تہذیب میں جس میں مردوں کا غلبہ ہوتا ہے، انسان اور جانور کی مشابہت پر اتنا زور دیا جاتا ہے۔ ٹوٹم کے ساتھ متحد ہونے کی خواہش کا اظہار اس طرح ہوتا ہے کہ لوگ خصوصاً تہواروں اور تقریبوں

میں اپنے جسم یا لباس پر ٹوٹم کے نشان بناتے ہیں۔ ٹوٹم کی نسل افزائش اور اس کی صحت اور قوت کو ترقی دینے کے لیے جادو کے عمل کیے جاتے ہیں اور یوں بھی اس تہذیب میں جادو ٹونے کا بہت زیادہ رواج ہے۔ مادری تہذیب میں تو فال شگون اور انفعالی توہمات زیادہ نظر آتے ہیں لیکن ٹوٹمی تہذیب میں، جس میں مردوں کا رنگ غالب ہے، عملی جادو کا زور ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں جرگے کے سردار کا رشتہ ٹوٹم سے بہت قریبی سمجھا جاتا ہے۔ یہ سردار پروہت کا کام بھی کرتے ہیں اور مذہبی رسموں کو انجام دیتے ہیں۔ لیکن خود ٹوٹم مذہبی احترام کا مستحق نہیں سمجھا جاتا۔ اس کو نقصان پہنچانا یا خفا کرنا جائز نہیں۔ اس سے دُور رہنے کی تاکید ہے بلکہ کہیں کہیں تو اسے چھونا بلکہ روزمرہ گفتگو میں اس کا نام تک لینا منع ہے۔ اس کی تصویروں اور شبیہوں کی عزّت کی جاتی ہے لیکن دیوتا تو کیا ایک بُت کے درجے تک بھی نہیں پہنچنے دیتے۔ ٹوٹم کے اعزاز میں جو رسمیں ہر سال ادا ہوتی ہیں انھیں حقیقی پرستش نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ وہ رشتہ داری کے اقرار کا ایک مؤدّبانہ طریقہ ہے (یہ رسم اب تک سارے ہندستان میں خصوصاً ان حصّوں میں جہاں کسی زمانے میں ٹوٹمی قبائل آباد تھے، اس شکل میں رائج ہے کہ ہر ذات کے لوگ اپنے اپنے پیشوں کے اوزار کی پوجا کرتے ہیں)۔

چونکہ بیرونی شادی کا دستور ٹوٹمی تہذیب کا لازمی جُز ہے اس لیے ایک جرگہ (اگرچہ وہ معاشی اور سیاسی حیثیت سے ایک مستقل جماعت ہے) بالکل الگ ہو کر نہیں رہ سکتا۔ اس کے لڑکوں کو کسی دوسرے

جرگے میں شادی کرنی پڑتی ہے۔ اس طرح دو یا دو سے زیادہ جرگوں کے جوڑ بن گئے۔ ہر جرگہ اپنے خیال میں جادو کے عمل سے اپنے ٹوٹم جانور یا پودے کی نسل کو ترقی دیتا ہے اور چونکہ خود اس کے لوگ نہ اسے چھو سکتے ہیں اور نہ کھا سکتے ہیں اس لیے گویا وہ دوسرے جرگے والوں کے لیے شکار اور غذا مہیا کرتے ہیں۔ یہ ساحرانہ تقسیم محنت کا اصول آگے چل کر مختلف دست کاروں کی جماعتوں میں عملی تقسیم محنت کا اصول بن گیا جس کی ٹوٹمی قبائل میں حیرت انگیز ترقی نظر آتی ہے۔ یہ ایک اور مثال ہے اس بات کی جو اکثر دیکھنے میں آتی ہے کہ ایک متوہمانہ یا لاعقلی اور جذباتی تحریک کی بدولت نوع انسانی نے علمی ترقیاں حاصل کیں اور آگے چل کر ان سے عملی فائدہ اٹھایا۔ پارس پتھر اور اکسیر کی تلاش میں انسان نے کیمیا کا علم ایجاد کیا۔

ٹوٹمی تہذیب کے مادی پہلو پر نظر ڈالیے تو (گو اسے مادری تہذیب کی طرح زراعت کی اور گلہ بانوں کی تہذیب کی طرح جانوروں کو پالنے کی بنیادی ایجاد کا فخر حاصل نہیں) معلوم ہوتا ہے کہ اس کے حاملوں کو کاریگری کا اچھا سلیقہ تھا اور انھوں نے بہت سے مفید اوزار اور آلات بنائے تھے۔ چنانچہ شکار کا جو سلیقہ امریکا کے اصلی باشندوں اور بحر منجمد شمالی کے لوگوں میں پایا جاتا ہے وہ گروس اور اشمٹ کے قول کے مطابق ان تدبیروں کا نتیجہ ہے جو ٹوٹمی قبائل نے ایجاد کی تھیں[11]۔ جانوروں کو گھیر کر ایک خاص سمت میں لانے کے لیے دیواروں اور پنکھوں کا بنانا، خاص قسم کے پھندے اور پردے جن کی آڑ میں شکاری آہستہ آہستہ آگے بڑھتے ہیں اور طرح طرح کے اوزار یہ سب اسی

زمرے میں شامل ہیں۔ چھرے اور پھینک کر مارنے کی لکڑیاں ٹوٹمی تہذیب کے مخصوص ہتھیار ہیں۔ مخروطی جھونپڑیاں اور بڑی بڑی مخروطی شکل کی چھتوں کے مکانات بھی اسی تہذیب کی طرف منسوب کیے جاتے ہیں۔ ہتیاروں اور مکانوں کی کڑیوں پر عموماً ٹیڑھی ٹیڑھی لکیروں کا آرائشی کام ہوتا ہے اور ٹوٹم کی شبیہیں بھی بہت کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ آرائش کا شوق خصوصاً مردوں میں حد سے زیادہ ہے۔ ٹوٹمی قبائل کے مردوں میں عورتوں سے کہیں زیادہ آرام طلبی اور خود نمائی پائی جاتی ہے۔ عورتوں کی حیثیت کسی قدر پست ہے مگر اتنی گری ہوئی نہیں جتنی ہمیں خانہ بدوش گلہ بانوں کی پدری تہذیب میں نظر آئے گی۔ مرد اپنے بالوں کے اونچے جوڑے باندھنے میں بہت تکلیف اور مشقت برداشت کرتے ہیں۔ خاص قسم کی لکڑی کی تپائیاں ایجاد کی گئی ہیں جن پر یہ خود نمائی کے بندے رات کو سر رکھ کر سوتے ہیں تاکہ ان کے جوڑے نہ کھلنے پائیں۔ جو تکلیف رات بھر بے قرینے سونے سے ہوتی ہے وہ کم سے کم پکے ٹوٹموں کے لیے اس خوشی کے مقابلے میں کوئی چیز نہیں جو انھیں اونچے جوڑوں کی نمائش سے ہوتی ہے۔ یہ بہت سی مثالوں میں سے ایک مثال ہے اس امر کی کہ جب قدیم روایات کے ساتھ خود پرستی کا جذبہ مل کر اس قسم کی رسموں کی پابندی کا تقاضا کرتا ہے تو انسان آرام، صحت اور رات کی نیند تک قربان کرنے پر تیار ہو جاتا ہے۔ ٹوٹمی قبائل کے ہتھیار بہت خطرناک اور تیز ہوتے ہیں۔ ایک مضبوط پیٹی جو ان ہتیاروں سے جسم کے نچلے حصے کو بچا سکے اس تہذیب کی مخصوص نشانی سمجھی جاتی ہے۔ پیٹی میں عموماً کسی مضبوط

چیز کی ایک چھوٹی سی صندوقچی بھی لگی ہوتی ہو جو مردوں کے عضو تناسل کو محفوظ رکھنے کے کام آتی ہو، معلوم نہیں اس قسم کا لباس اختیار کرنے کی کوئی عملی وجوہ ہیں یا محض خیالی۔ ایک خاص قسم کے تبر سے جو بڑی کاریگری سے بنایا گیا ہو ٹوٹمی تہذیب کے بڑھئی ایک سالم درخت سے اپنی سبک اور متوازن ڈونگیاں تراشتے ہیں۔

ٹوٹمی تہذیب کے معاشرتی نظام کی اہم خصوصیات اس کی تعریف کے سلسلے میں بیان کی جاچکی ہیں۔ انھیں یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔ صرف اتنا کہ دینا کافی ہو کہ بعض خاص اصولوں کی بنا پر شادیاں جرگے کے باہر ہوتی ہیں اور معاشرت عموماً پدری تہذیب کے طرز کی ہوتی ہو اگرچہ کہیں کہیں ٹوٹمی تہذیب کا میل مادری تہذیب کے ساتھ بھی دیکھنے میں آتا ہو۔ لڑکوں کو جرگے کا رکن اور اس کی روایات کا محرم بنانے کی رسم خاص اہمیت رکھتی ہو۔ اس سے پہلے یہ لوگ ایک مدّت تک "مجرّد خانوں" میں رکھے جاتے ہیں۔ لڑکیوں کی محرمی کی رسم عموماً ادا نہیں ہوتی اور نہ ان کی پہلی ماہواری منائی جاتی ہو۔ تاہم وہ شخصی اور جنسی آزادی جو لڑکیوں کو اوّلیں تہذیب میں حاصل تھی ٹوٹمی تہذیب میں بالکل معدوم نہیں ہوئی۔ اس آزادی میں عورتوں کی پست حالت اور مردوں کی تحکم پسندی کی وجہ سے کبھی کبھی "جنسی غلامی" کا رنگ پیدا ہو جاتا ہو۔ پھر بھی جب تک لڑکیوں کی شادی نہیں ہوتی ان کی حالت کچھ ایسی خراب نہیں کہی جاسکتی اور انھیں اوّلیں تہذیب کے حقوق میں سے کم سے کم اتنا حق باقی ہو کہ اپنی مرضی سے جس کے ساتھ چاہیں

تعلق پیدا کریں۔ بہ خلاف اس کے شادی شدہ عورتوں کو ایک حد تک غلامی کی اس ذلت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے جو خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں بیاہی اور کنواری سبھی عورتوں کے حصے میں آتی ہے۔ ختنہ اور دوسرے عمل جو محرمی کی رسم کے وقت لڑکوں کے عضو تناسل کے ساتھ کیے جاتے ہیں یہ بھی مردوں کی اہمیت پر زور دینے کی مختلف شکلیں ہیں۔ مردوں کی خفیہ انجمنیں جو مادری تہذیب کی پیداوار ہیں کبھی کبھی ٹوٹمی قبائل میں بھی نظر آتی ہیں۔ یہاں ان کی صورت کچھ مختلف ہے اور ان کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ چونکہ ٹوٹمی تہذیب میں عورتیں پہلے ہی سے مغلوب ہیں اس لیے انھیں بھوت پریت کے روپ میں یا کسی اور قسم کے خوفناک چہرے لگا کر دھمکانے کی جس کا مادری تہذیبوں میں دستور ہے، کوئی ضرورت نہیں۔ ان انجمنوں کا سب سے بڑا مقصد ساحرانہ رسموں کے ذریعے ٹوٹم سے اپنے رشتے کا اعتراف کرنا ہے۔ وہ "مجرد خانوں" اور محرمی کی رسموں کی نگرانی بھی کرتی ہیں۔ اکثر یہ انجمنیں عمر یا مراتب محرمی کے لحاظ سے کئی درجوں میں تقسیم ہوتی ہیں۔ یہ مردوں کی انجمنیں ایک حد تک جرگے کے سردار کی غیر محدود قوت کی جو اُسے ٹوٹمی تہذیب میں حاصل ہوتی ہے حد بندی کرتی ہیں۔

ٹوٹمی قوموں کا مذہب بھی ان کے مادی اور معاشرتی نظام کی طرح بڑے اور بنیادی تصورات سے خالی ہے۔ ہاں اگر ہم اس فرضیے کو صحیح مانیں جس کی رو سے سورج کی پرستش کا آغاز ٹوٹمی تہذیب میں ہوا تو دوسری بات ہے۔ اس میں لوگوں کو شبہہ ہے۔

حالانکہ یہ واقعہ ہے کہ خدا کی پرستش کا یہ اشارتی طریقہ بہت سی ٹوٹمی قوموں میں پھیلا ہوا تھا۔ بعض قبائل میں سورج کی شکل کی ایک ٹکیہ جو اکثر سونے کی بنی ہوتی ہے، پہنی جاتی ہے۔ کسی جانور سے رشتہ قائم کرنا بھی ٹوٹمی تہذیب والوں کے مذہبی خیالات کا ایک جُز ہے۔ یہ لوگ نہ صرف دُنیا کی بلکہ آخرت کی زندگی کا بھی مادّی تصوّر رکھتے ہیں جیسا کہ ان کی دیو مالا سے معلوم ہوتا ہے۔ جادو کے عمل کے ذریعے افراد اور جماعتوں کی قسمت پر اثر ڈالنے کی خواہش بہت نمایاں ہے۔

ٹوٹمی قوموں کی ذہنیت کے نمونے ہم تقسیمِ محنت کے اصول اور ٹوٹم کے تخیّل میں دیکھ چکے ہیں۔ اس ذہنیت کی ایک اور خصوصیت زبان کا تقسیمی نظام ہے جو ان لوگوں نے مرتّب کیا ہے[۱۲]۔ ان زبانوں میں اجزائے کلمہ کو بڑی اہمیت حاصل ہے جو اشیا کی صفات بتاتے ہیں اور ان کے باہمی فرق کو ظاہر کر کے ان کی تقسیم در تقسیم کرتے چلے جاتے ہیں۔ کوئی تعجب نہیں اگر زبان کا تقسیمی نظام سب سے پہلے انھیں لوگوں نے ایجاد کیا ہو۔

ٹوٹمی قبائل کی جغرافی تقسیم کم و بیش وہی ہے جو مادری تہذیب کی حامل قوموں کی۔ ان کے ناموں اور مقاموں کی مختصر فہرست ہم اس باب کے آخر میں پیش کریں گے۔

خاتمہ

ٹوٹمی تہذیب بھی اُسی اصلی یا اوّلیں تہذیب سے نکلی ہے جو مادری

تہذیب اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کا سرچشمہ ہے۔ اوّلیں تہذیب میں غالباً جنوبی علاقے کے لوگ ٹوٹمی تہذیب سے خاص تعلق رکھتے ہیں۔

ٹوٹمی جرگوں اور ساری ٹوٹمی تہذیب کے قیام کی بنیاد اس طرح پڑی کہ اوّلیں تہذیب کے کچھ لوگوں نے جو خاص طور پر مستعد تھے شکار کی طرف خاص توجّہ کی اور اس کے نئے اور بہتر طریقے نکالے۔ انسانوں اور جانوروں کے باہمی رشتے کے عقیدے کو بھی اس سے قریبی تعلق رہا ہوگا۔ اس خیالی رشتے کو جو اہمیت ٹوٹمی قوموں کے نزدیک حاصل ہے اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ یہی انسان اور جانور کے تعلق کا عقیدہ تھا جس سے پہلے ٹوٹم کا تصوّر پیدا ہوا اور آگے چل کر شکار کے فن کو ترقی ہوئی۔

ٹوٹمی تہذیب کے مادّی پہلو کی بنیادی خصوصیات میں ایک تو شکار کے بہتر طریقے ہیں اور دوسرے وہ ترقی جو دست کاری کو تقسیمِ محنت کے اصول کی وجہ سے ہوئی۔ مخروطی جھونپڑی یا مکان، جارحانہ ہتھیار، خوشنما اور سبک اوزار، ٹیڑھی ٹیڑھی لکیروں کا آرائشی کام، آرائش کا شوق خصوصاً مردوں میں ٹوٹمی قوموں کی تہذیب کے اہم عناصر ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی تمدّن کے مادّی کارناموں میں ٹوٹمی تہذیب کا حصّہ مادری تہذیب سے بہت کم ہے۔

معاشرتی زندگی کی بنیاد جرگوں کی ایک خاص تنظیم، بیرونی شادی کے دستور اور اس خیالی رشتے پر قائم ہے جو جرگے کے لوگوں کا

ایک دوسرے سے اور جرگے کے ٹوٹم سے سمجھا جاتا ہے۔ یہ فرضی رشتہ
تقسیمِ محنت اور قبیلے اور جرگے کی تقسیم و تربیت کا محرک ہوا

لڑکوں کی محرمی کی رسمیں، مردوں کی انجمنیں اور جرگے کے سردار
کا بلند مرتبہ اس تہذیب میں خاص طور پر نمایاں ہے۔ عورتوں کی حیثیت
خصوصاً شادی کے بعد پست ہوتی ہے مگر بن بیاہی لڑکیوں میں اس
شخصی آزادی کا کچھ بچا کھچا حصہ باقی ہے جو انھیں اوّلیں تہذیب
میں لڑکوں کے پہلو بہ پہلو حاصل تھی۔

ٹوٹمی معاشرتی تنظیم سے ترقی یافتہ مہذب قوموں نے جو
چیزیں حاصل کیں وہ تقسیمِ محنت کا اصول، صنعت و حرفت کی تنظیم
اندرونی ضبط اور سردار کی اطاعت ہے۔

ٹوٹمی مذہب کے متعلق یہ خیال ہے کہ سورج کی پرستش اسی
سے نکلی ہے لیکن یہ امر ابھی تک مسلّم نہیں ہے۔ جانوروں کا غور سے
مشاہدہ کرتے کرتے ان لوگوں میں یہ عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جانور
اور انسان میں گہری مشابہت اور قریبی رشتہ ہے۔ گویا ہم یہ کہہ سکتے
ہیں کہ ڈارون کے نظریہ کی داغ بیل ان ہی لوگوں نے ڈالی تھی۔
ان کے ہاں سورج دیوتا سے مل کر حیاتِ ابدی حاصل کرنے کا
رُجحان بہت نمایاں ہے۔ مگر اس سے بھی زیادہ نمایاں جادو کے
عمل ہیں جن کے ذریعے سے انسانوں اور جانوروں، افراد اور
جماعتوں کی زندگی پر اثر ڈالنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

مجموعی طور پر ٹوٹمی تہذیب انسان کی تمدنی جدو جہد کی محض ایک
ضمنی راہ معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نوعِ انسانی کو جو فائدے حاصل

ہوئے انھیں حقیر نہیں سمجھنا چاہیے پھر بھی ہمیں یہ جان لینا چاہیے کہ
کہ ٹوٹمی تہذیب کبھی اس بلند درجے تک نہیں پہنچی جس کا مقابلہ مادری
تہذیب کی شہری ریاستوں سے کیا جا سکے، اس لیے یہ قدرتی امر
تھا کہ ٹوٹمی تہذیبیں رفتہ رفتہ دوسری تہذیبوں خصوصاً مادری تہذیب
کے ساتھ ہِل جُل گئیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ آج کل ہمیں آسٹریلیا کے
باہر مشکل سے کوئی ایسی ٹوٹمی قوم ملے گی جو زراعت سے واقف
نہ ہو حالانکہ اس نظریہ کے قوی دلائل موجود ہیں کہ ابتدا میں ٹوٹمی
قومیں صرف شکار اور غذا کے جمع کرنے پر زندگی بسر کرتی تھیں۔

ٹوٹمی قبائل کی جغرافی تقسیم اس طرح سے ہے کہ وہ انھیں مقامات
کے قریب آباد ہیں جو مادری تہذیب کی حامل قوموں کے اصلی
وطن ہیں

ہندستان میں ٹوٹمی تہذیب کا مرکز وسطی سطح مرتفع اور دکن ہے
جہاں اوراؤ، کارکو، سنتال، منڈا، ہو، گو، کھنڈ اور بہت سی تلنگی بولنے
والی قومیں آباد ہیں۔ آسام میں اس تہذیب کے آثار مادری تہذیب
کی حامل کھاسی اور گیرو قوموں اور اکثر ناگا قبائل میں پائے جاتے ہیں

انڈونیشیا میں ٹوٹمی تہذیب کا رنگ سماترا کی باٹک قوم میں موجود
ہے مگر اتنا گہرا نہیں جتنا ملانیشیا والوں میں ہے۔ ان کے سارے خیالات
ٹوٹمی ہیں لیکن ان میں مادری تہذیب کے تصوّرات بھی ملے جُلے
ہیں اور یہ زراعت سے واقف ہیں جو مادری تہذیب کا اہم عنصر
ہے۔ اس سلسلے میں نیوگنی کی سیپک وادی کے قبائل جزائر سالومن کے
باشندوں اور نیو کیلے ڈونیا کے رہنے والوں کا ذکر خاص طور پر کرنا چاہیے۔

آسٹریلیا میں وادیٔ مرے کی زنجیری قوم ٹوٹمی شکاریوں کی ایک اچھی مثال ہے، یہ لوگ وراثتِ مادری کا نام تک نہیں جانتے اور زراعت سے بھی ناواقف ہیں۔ ان کے ٹوٹمی جرگوں اور مقامی جماعتوں کو دیکھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اوّلیں تہذیب کی مقامی جماعتوں سے ٹوٹمی جرگے کیونکر بنے ہوں گے۔ مغربی اور مشرقی آسٹریلیا میں ٹوٹمی تہذیب قریب قریب بیرونی مداخلت سے پاک رہی۔ لیکن وسطی آسٹریلیا کے صحراؤں میں غالباً شمال کی طرف سے ایک مادری تہذیب کی حامل قوم پہنچی اور اس نے ٹوٹمی معاشرت میں بہت کچھ تبدیلی کردی۔

افریقہ میں جنوبی وسطی علاقے کی بنٹو بولنے والی قوموں کے مقابلے میں شمالی وسطی علاقے کی سوڈانی بولنے والی قوموں میں ٹوٹمی تصوّرات زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ان میں کیمروں کی فانگ قوم، مغرب کی ازانڈے یا نیام نیام اور جروبا اور ڈھوم یا اشانتی قوم، جس نے مغربی افریقہ کی شہری ریاستیں قائم کی تھیں، سب کی تہذیب ٹوٹمی اور مادری تہذیبوں کے عناصر سے مرکب ہے۔ جنوبی نلوئی علاقے میں ڈنکا شلک اور نوئر اور نلوئی ہامی قبائل میں ساٹی اور باری کم و بیش ٹوٹمی معاشرت رکھتے ہیں۔ بنٹو زبان بولنے والے حبشیوں میں اگانڈا قوم سب سے زیادہ ٹوٹمی خصوصیات رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ کانگو کے جنگلی خطّے اور مشرقی بنٹو علاقے میں کئی قبائل بالکل ٹوٹمی ہیں اور انھیں کی بدولت بونوں نے ٹوٹمی تہذیب اختیار کی جس کا ذِکر ہم اوّلیں تہذیب کے باب میں کر چکے ہیں۔

شمالی افریقہ میں ٹوٹمی تہذیب کے دو مرکز ہیں:-

(الف) وادیٔ اوہیو جہاں اوّلیں تہذیب کی حامل الگونکن، مادری تہذیب کی حامل ایروکواس اور سکوگی قوموں نے سیوکس اور یوچی قوم سے ٹوٹمی تہذیب حاصل کی۔

(ب) ہوپی اور سونی پیوبلوس قوموں کا علاقہ۔ ان قوموں میں ٹوٹمی تصوّرات مادری تہذیب کی معاشرتی تنظیم کے ساتھ مِلے جُلے ہیں۔

شمالی امریکا کے شمال مغربی علاقے میں ٹوٹمی تہذیب نہیں پائی جاتی۔ حالانکہ اصلی مادری تہذیب کی حامل ٹلنگٹ، ہیڈا اور زِمشی قومیں موجود ہیں۔ یہ خالص مادری تہذیب کی مثال ہے جس کا مقابلہ جنوب مغربی ہند میں ملابار کی مادری تہذیب سے کیا جا سکتا ہے البتہ اتنا فرق ہے کہ شمال مغربی امریکا کی قومیں تمدّنی ترقی کے اس درجہ تک نہیں پہنچیں جو ملابار میں نائر قوم اور دوسری قوموں نے حاصل کر لیا ہے۔

وسطی امریکا میں ازٹیک اور مایا قوم کی قدیم تہذیب میں ٹوٹمی تہذیب کے کچھ دھندلے سے آثار ملتے ہیں۔

جنوبی امریکا میں کوہ انڈیس کے علاقے کی ترقی یافتہ تہذیبیں اس بات کی مثال پیش کرتی ہیں کہ مادری تہذیب کی ایک لہر آئی اور اس نے وہاں کی ابتدائی تہذیب کو مٹا کر اس کی جگہ لے لی۔ اس صورتِ حال سے جو شمالی آسٹریلیا کی حالت سے مشابہ ہے یہ خیال ہوتا ہے کہ ٹوٹمی تہذیب مادری تہذیب سے زیادہ پُرانی ہے لیکن دوسرے ملکوں میں مثلاً ہندستان میں معاملہ اس کے برعکس ہے۔ اس میں شک نہیں کہ مادری تہذیب کی شہری ریاستیں تو درکنار اس تہذیب کی

تیسری منزل بھی ٹوٹمی تہذیب کے بعد کی ہے۔ لیکن میرے خیال میں مادری تہذیب کی پہلی منزل اگر ٹوٹمی تہذیب سے پُرانی نہیں تو اس کے بعد کی بھی نہیں ہے۔ البتہ اس کی دوسری منزل کے متعلق یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کی سب سے بڑی خصوصیت یعنی دوئی کا طریقہ ٹوٹمی تہذیب کے اثرات کا نتیجہ ہے۔

جنوبی امریکا کے جنگلی علاقے میں جا بجا ٹوٹمی تہذیب دوئی کے طریقے کے ساتھ بورورو منڈروکی، اراوک کے بعض قبائل مثلاً پیلی کور وغیرہ میں پائی جاتی ہے۔ مشرقی پیرو کی اوئیٹوٹو قوم میں بھی ٹوٹمی تہذیب کے بعض عناصر موجود ہیں۔

ٹوٹمی تہذیب کے متعلق کتابیں اکثر وہی ہیں جن میں مادری تہذیب اور اس کے مسائل سے بحث کی گئی ہے۔ میک لینن (جیسا کہ ہم تاریخِ علم الاقوام کے باب میں کہہ چکے ہیں) اس خیال کا بانی ہے کہ ٹوٹمی تہذیب انسان کے ایک خاص تصورِ زندگی کی مظہر ہے۔ اس نے بیرونی شادی کے طریقے کی اہمیت بھی دکھائی ہے۔ ٹوٹمی تہذیب پر سب سے مستند کتاب فریزر کی "ٹوٹمی تہذیب اور بیرونی شادی" ہے جو ۱۹۱۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ اس کی "شاخِ زریں" بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس میں پُرانے ماخذوں سے معلومات جمع کر کے اس کا باہم مقابلہ کیا گیا ہے۔ گریبنر نے ۱۹۰۴ء میں "مغربی پاپوا کا تہذیبی دائرہ" لکھ کر ٹوٹمی تہذیب کی بحث کے سلسلے میں تہذیبی دائرے کا تصوّر پیش کیا۔ فوائے اور و۔ اشمٹ نے ٹوٹمی تہذیب کے مسائل کے متعلق بہت کچھ نظری معلومات بہم پہنچائی۔

ساتواں باب

خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب

پچھلے دو بابوں کے شروع میں ہم نے یہ کہا تھا کہ صرف وراثتِ مادری کا رواج تہذیبِ مادری کے وجود پر دلالت نہیں کرتا اور ٹوٹمی تہذیب محض ٹوٹم کے عقیدے کا نام نہیں، اسی طرح ہمیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ صرف جانوروں کے پالنے سے کوئی قوم خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی حامل نہیں کہلا سکتی۔ اس کی اور بھی کئی خصوصیات ہیں:۔

پہلی بات یہ ہے کہ جانوروں کو سدھانے اور پالنے میں فرق ہے۔ سدھائے ہوئے شیر، طوطے یا لم ڈھیک خواہ وہ چڑیا خانے میں ہوں یا بادشاہ کے محل میں، پالتو جانور نہیں کہلا سکتے، باوجود اس کے کہ وہ عمر بھر وہیں رہتے ہیں، وہیں بچّے دیتے ہیں اور اپنے مالکوں سے ہلے ہوئے ہوتے ہیں۔ علم حیوانات کے نقطۂ نظر سے پالتو جانور وہ کہلاتے ہیں جن کی صورت شکل اور عادات میں اتنی تبدیلی ہو گئی ہو کہ ان کی ایک نئی قسم بن گئی ہو اور یہاں تک کہ اگر وہ پھر چھوٹ کر جنگل میں چلے جائیں تو کئی پشت تک اپنی نوع کے دوسرے جانوروں سے مختلف رہیں۔ اس لحاظ سے کتّا، بلّی، گھوڑا،

گدھا، اونٹ، شمالی ہرن، گائے، بیل اور بھینس وغیرہ پالتو جانور ہیں۔ مگر شکاری باز، چیتا اور ہاتھی ان میں داخل نہیں۔ علم الاقوام، علم حیوانات کی اس تعریف کو تسلیم کرتا ہے۔ لیکن وہ اپنی طرف سے اتنا اور اضافہ کرتا ہے کہ کسی قوم کے لوگ جانوروں کو پالنے والے صرف اس وقت کہلائیں گے جب یہ ان کا عام شغل ہو اور انھیں اس سے مستقل آمدنی ہوتی ہو۔

خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی خصوصیات ان قوموں میں نہیں پائی جاتیں جو چھوٹے جانور مثلاً سور یا مرغیاں وغیرہ پالتے ہیں۔ کتّوں کا پالنا ہر تہذیب کے اکثر لوگوں میں مشترک ہے۔ گلہ بانوں کی ایک مخصوص، اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی تہذیب صرف ان ہی لوگوں نے پیدا کی جو بڑے بڑے جانوروں مثلاً شمالی ہرن، گھوڑے، گدھے، بھیڑ بکری کے گلوں کے مالک تھے، کم و بیش خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے تھے اور وسطِ ایشیا اور شمالی ایشیا کے خشک میدانوں میں غذا کی تلاش میں پھرا کرتے تھے۔ گائے، بیل بھینس یا Jayal کے پالنے والے اس زمرے میں شامل نہیں۔ اس مخصوص صورت کے متعلق ہم آگے بحث کریں گے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہے کہ غالباً ابتدا میں یہ جانور صحیح معنی میں پالے نہیں بلکہ صرف سدھائے جاتے تھے اور لوگ انھیں اس طرح رکھتے تھے جیسے ہم چڑیا خانے میں جانوروں کو رکھتے ہیں۔ اس فرضیہ کے مطابق ترقی یافتہ مادری تہذیبوں کے حامل سانڈ کو اس لیے پسند کرتے تھے کہ اس کے سینگ ہلال سے مشابہت رکھتے ہیں اور اُسے چاند کی نسبت سے

مقدس سمجھ کر سدھاتے تھے۔ آگے چل کر خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کے اثر سے اور شاید اس عملی تجربے کی وجہ سے بھی کہ گائے کا دودھ بہت مفید چیز ہے یہ لوگ گائے بھینس کو پوری طرح پالنے اور انھیں اپنے کھیتوں کے قریب باڑیں رکھنے لگے۔

گلہ بانوں کی سچی تہذیب کی بنیاد خانہ بدوشی کی زندگی ہے۔ اس کا تعلق ان خاص حالات سے ہے جن میں وسطی اور شمالی ایشیا کے "بیہڑوں" میں بڑی قسم کے جانور پالے جاتے تھے۔ ان جانوروں کے گلّے خود بھی مارے مارے پھرنے کے عادی تھے اس لیے کہ ایک طرف چارے کی کمی اور دوسری طرف سارے ملک کا ایک کفِ دست میدان ہونا، ان دونوں چیزوں کا یہ تقاضا تھا کہ وہ غذا کی تلاش میں دوُر دوُر تک پھرتے تھے۔

ہم کتّوں کے پالنے کو خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی، ایک ابتدائی منزل قرار دے سکتے ہیں۔ یوں تو کتّوں کو سدھانا اور پالنا بہت سی تہذیبوں میں مشترک تھا اور اب بھی ہے لیکن ہمارے پیش نظر اس کی ایک خاص صورت ہے یعنی شمالی ملکوں یا بحر منجمد شمالی کے علاقوں میں کتّوں کو گاڑی وغیرہ کھینچنے کے لیے سدھانا۔ یہاں کتّا جو کام انجام دیتا ہے وہ نہ تو شکار کا ہے، نہ چوکی داری کا، نہ رفاقت کا بلکہ نقل وحمل کا جس سے خانہ بدوشی کی زندگی میں مدد ملتی ہے، اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ کتّوں کو سدھاکر ان سے پھسلنے والے تختے کھچوانا، خانہ بدوش گلہ بانوں کی معیشت کی پہلی کوشش یا پہلی منزل ہے۔

یہاں اگر ہم کتوں کی نسل کی نشو و نما اور ان کے پالے جانے کی تاریخ پر علم حیوانات، آثارِ قدیمہ اور علم الاقوام کے نقطہ نظر سے اختصاً کے ساتھ نظر ڈالیں تو فائدے سے خالی نہ ہوگا۔

پالتو کتوں کے مورث کئی جانور قرار دیے جا سکتے ہیں:۔

(الف) شمالی بھیڑیا جس کی نسل سے ہمارے ہاں کے معمولی کتے ہیں۔ عہدِ متاخر حجری میں سوی زرلینڈ میں آباد ہونے والے قبائل کے کتے بھی اسی نسل سے تھے۔

(ب) گیدڑ جو چھوٹی قسم کے پالتو کتوں کا مورث ہے۔

(ج) اصلی جنگلی کتا جس کا اب کہیں نشان نہیں۔ پروفیسر آشلر کے پاس اس کا معقول ثبوت ہے کہ کسی زمانے میں اس کا وجود تھا۔

دنیا کے تمام ملکوں میں سے صرف شمالی ایشیا اور شمالی امریکا کی ابتدائی قوموں نے کتوں کو شکار اور چوکی داری کے لیے نہیں بلکہ پھسلنے والے تختوں پر بوجھ لے جانے کے لیے سدھایا۔ آثارِ قدیمہ کی شہادت سے ثابت ہوتا ہے کہ اگر کتوں کو باقاعدہ پالنا نہیں تو ان کو سدھانا عہدِ متاخر حجری کے ابتدائی دور میں شروع ہوگیا تھا۔ اسکنڈینویا میں اریٹیو یے کے کیوکن موڈنگر، کنڈا اور ماگلموس میں کتوں کی ہڈیاں پائے جانے کے بعد اس میں ذرا بھی شبہہ نہیں رہتا۔ موگھم (پرتگال) کے آخری کیپسی دور کے متعلق جو معلومات حاصل ہوئی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ کتوں کو پالنا سب سے پہلے ایک جنوبی ملک میں شروع ہوا۔ لیکن کتوں کو پال کر ان سے نقل و حمل کا کام لینا اُس زمانے میں بھی یقیناً شمالی علاقے تک محدود ہوگا اس لیے

کہ صرف اُسی ملک میں جو سال کے بڑے حصّے میں برف سے ڈھکا رہتا ہو، کتّا نقل و حمل کے لیے زیادہ مفید ہو سکتا ہے۔ یہاں کتّا معاشی زندگی کا ایک اہم جُز ہے۔ کتّے پالنے والی خانہ بدوش قوموں میں سب سے اہم سائبیریا کے سموئی اور تنگوسی اور شمالی امریکا کے اسکیمو ہیں۔

ہم نے اس مسئلے کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا۔ اس لیے کہ کُل قرائن سے اس خیال کی تائید ہوتی ہے کہ شمالی ہرن پالنے والی قوموں نے (جو سب سے پہلے خانہ بدوش گلہ بان سمجھے جاتے تھے) جانوروں سے نقل و حمل کا کام لینا منطقۂ باردہ کی ان قوموں سے سیکھا جو کتّے پالتی تھیں۔

ہرن پالنے والے اب تک پائے جاتے ہیں۔ ان میں خانہ بدوش گلّہ بانوں کی تہذیب کی سب سے پُرانی شکل اب تک باقی ہے۔ اس کے علاوہ بڑے پالتو جانوروں میں صرف شمالی ہرن ہی ایسا جانور ہے جو بالکل جنگلی پن کی حالت میں بھی سدھائے جانے میں کچھ زیادہ مزاحمت نہیں کرتا۔ ان سب باتوں سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ہرن پالنے والے سب سے پہلے خانہ بدوش گلہ بان تھے۔ ہرن پالنے والوں کا مقابلہ گھوڑے، اونٹ اور یاک پالنے والوں سے جو ہم اس باب میں آگے چل کر کریں گے، اس خیال کی مزید تائید کرتا ہے۔

ذرا ان حالات پر نظر ڈالیے جن میں شمالی ہرن تاریخ میں پہلی بار پالتو بنائے گئے تھے اور آج تک بنائے جاتے ہیں۔

شمالی ہرن 'توندرا'[1] میں رہتے ہیں۔ سال کے بڑے حصّے میں یہ چوڑے کھلے میدان برف سے ڈھکے رہتے ہیں اور بچارے جانوروں کو چھال کے ٹکڑے اور سوکھے پودے جن پر انھیں بسر کرنی پڑتی ہے، بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ گرمی کے تھوڑے سے مہینوں میں چوبیس میں سے بیس گھنٹے نم اور مرطوب زمین دھوپ سے تپتی رہتی ہے۔ نباتات بہت کثرت سے ہوتی ہیں لیکن بے رحم فطرت نے ایک چیز ایسی پیدا کردی ہے جو زندگی کے ہر لمحے کو دوزخ بنادیتی ہے یعنی وہ لاکھوں، کروروں مچھّر جن سے ہر جانور کو سچ مچ جان کا خطرہ رہتا ہے۔ اگرچہ ہندستان کے بعض حصّوں میں بھی لوگوں کو جو سونے لیٹتے ہیں اور مچھروں کے کاٹے سے اپنا سارا جسم سُجا لیتے ہیں بہت سخت تکلیف ہوتی ہے لیکن جو ظلم منطقۂ باردہ کے مچھّر ڈھاتے ہیں اس کے مقابلے میں یہ کوئی چیز نہیں۔ مچھّروں کے موسم میں لوگوں کو جسم کے ان سب حصوں پر جو کھلے ہوتے ہیں چکنی مٹی کا لیپ کرنا پڑتا ہے۔ قطبی علاقے کی گرمی اور تپش میں خود یہی اک ایسا عذاب ہے جس کا کوئی اندازہ نہیں کرسکتا۔ پھر اس پر طرّہ یہ کہ ہلنے جلنے سے مٹی میں جو درز پڑجاتے ہیں ان سے خون کے فوّارے اُبلنے لگتے ہیں اس لیے کہ مچھّروں سے بچنا ناممکن ہے۔ اس کا صرف ایک ہی علاج ہے یعنی آگ کا دھنواں۔ ان غریب توندرا کے باشندوں کو گرمی کے سارے موسم میں جب قریب قریب ہر وقت دن رہتا ہے نہ کبھی اندھیرا ہوتا ہے اور نہ گہری نیند آتی ہے، آگ جلتی رکھنی پڑتی ہے۔

[1] شمالی امریکا کا میدان جس میں کائی اُگی ہوتی ہے اور اکثر دلدل بھی ہوتی ہے۔

مچھروں کی یہ مصیبت جانوروں کے لیے بھی اتنی سخت ہے کہ اکثر جنگلی جانوروں کے جھنڈ آگ پر اس زور سے ہلّہ کرتے ہیں کہ پیچھے والوں کے دھکّے سے آگ والے آگ میں گر کر جل جاتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آگ شمالی ہرنوں کے لیے کس قدر کشش رکھتی ہے۔ اس کی وجہ سے آج بھی جنگلی ہرنوں کو، جو مچھّروں سے بچنے کے لیے آگ کے پاس دوڑ کر آتے ہیں، پالتو بنانا آسان ہے۔ اس کے مقابلے میں بڑے جانوروں خصوصاً گھوڑے کو قابو میں لانا بہت مشکل ہے اور اس کے لیے بڑی معلومات، ہوشیاری، مشق اور صبر کی ضرورت ہے اور اس کی توقع صرف انھیں لوگوں سے کی جا سکتی ہے جنھیں کسی دوسرے، آسانی سے قابو میں آنے والے جانوروں کو پالنے اور اس سے فائدہ اٹھانے کا تجربہ ہو۔ غرض یہ فرضیہ کہ شمالی ہرنوں کو پالنے والی قومیں سب سے پہلے خانہ بدوش گلہ بانوں کی یادگار ہیں معقول دلائل پر مبنی سمجھا جا سکتا ہے۔

وہ مادری تہذیب جو شمالی ملکوں میں جانوروں کو پالنے اور چرانے سے متعلق معاشی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے وجود میں آئی مادری تہذیب اور ٹوٹمی تہذیب والوں کے معاشی نظام سے بہت کچھ مختلف ہے۔ لوگوں کی غذا زیادہ تر جانوروں کے گوشت اور آگے چل کر ان کے دودھ اور پنیر پر منحصر ہوتی ہے۔ اگر خود جانوروں کو چارہ نہ ملے یا وہ بیمار پڑ جائیں تو ان کے مالکوں کو موت کا سامنا ہے۔ اس لیے یہ لوگ اپنے گلّوں کے لیے بہترین چراگاہیں ڈھونڈھنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں اور ان کی خاطر لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کی دو خصوصیات اسی ضرورت پر مبنی ہیں۔ ایک

توان کی جنگجوئی جو اوّلیں تہذیب میں بالکل معدوم تھی، مادری تہذیب میں بہت کم ہے اور ٹوٹمی قبائل میں صرف فنِ حرب کے مقابلوں کی شکل میں پائی جاتی ہے۔ لیکن گلہ بانوں کی تہذیب میں ایک ناخوشگوار ضرورت اور کشمکش حیات کا ایک لازمی جُز ہے۔ دوسرے ان کی خانہ بدوشی یعنی سارے خاندان اور املاک کو ساتھ لے کر اور دُور و دراز فاصلے طے کرکے ایک چراگاہ سے دوسری چراگاہ میں پہنچنا۔ چمڑے کا خیمہ اور کمان ان لوگوں نے یقیناً اوّلیں تہذیب سے لی ہے۔ ان کا "یُرٹ" یعنی چمڑے کا خیمہ اب تک ٹوکری یا چھتے کی شکل کا ہوتا ہے جیسا اوّلیں تہذیب میں ہوا کرتا تھا۔ کمان میں کچھ ترقی ہوئی ہے اس لیے کہ ایک توان کو کھلے میدان میں دور تک تیر پھینکنے کی ضرورت ہے دوسرے ان کی کمان لکڑی سے نہیں بلکہ ہڈی وغیرہ کو جوڑ کر بنائی جاتی ہے۔ گلہ بانوں کی تہذیب کی پہلی منزل میں خم دار اور مرکب کمان پائی جاتی ہے۔ آگے چل کر اس تہذیب کے ان حاملوں نے جو گھوڑے پر سوار ہوتے تھے، نیزہ اور کمند ایجاد کی۔ چہرے اور ہاتھوں کے سوا سارے جسم کو ڈھکنے کا رواج منطقۂ باردہ کی آب و ہوا کا نتیجہ ہے۔ لباس زیادہ تر جانوروں کی کھال کا ہوتا ہے جسے دانتوں سے چبا کر یا سیخ سے نرم کرتے ہیں۔ جب تک بچھڑے نہ ہوں عورتیں عموماً ننگی رہتی ہیں لیکن بچھڑوں کے پیدا ہوتے ہی ان غریبوں کو پھر میلے چمڑے اور سمور کی پوشاک پہننی پڑتی ہے۔ غالباً اس لباس میں جکڑے رہنے کی وجہ سے اس تہذیبی دائرے میں بد قطع، موٹے اور بھدّے انسان نظر آتے ہیں حالانکہ مادری تہذیب اور ٹوٹمی تہذیب کے

حامل خوبصورت، سڈول، چھریرے اور مضبوط بدن کے ہوتے ہیں۔ گلہ بان قوموں کے جسمانی تنزل کی ایک وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ وہ صرف گوشت کھاتے ہیں اور اکثر عورتیں کسی قسم کی ورزش نہیں کرتیں۔ لیکن سب سے بڑا سبب جدید طب اور حفظانِ صحت کے مطابق یہی ہے کہ ناموافق آب و ہوا کی وجہ سے انھیں حد سے زیادہ کپڑے پہننے پڑتے ہیں۔ انسان کے جسم سے پسینہ بہت بڑی مقدار میں خارج ہوتا ہے اور اس میں اسی قسم کا فاسد مادّہ ہوتا ہے جیسا پاخانے اور پیشاب میں۔ اگر جلد ننگی ہو تو یہ فاسد مادّہ بھاپ بن کر اُڑ جاتا ہے۔ اس لیے انسانی جسم کے لیے جلد سے سانس لینا نہایت ضروری ہے۔ اگر اس میں رُکاوٹ ہوتی ہے اور پسینہ کپڑوں میں اور جلد میں جذب ہوتا ہے تو جسم کی تفریح اور تازگی کی ایک شاہراہ بند ہوجاتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ پہلے جلد، پھر عضلات جن سے بدن چُست رہتا ہے اور آخر میں سارا جسم ڈھیلا اور نِکمّا ہوجاتا ہے۔ آدمی پھول جاتا ہے اور اس کی صحت اور خوبصورتی دونوں کو نقصان پہنچتا ہے۔ ضرورت سے زیادہ لباس پہننے کے نفسیاتی اثرات بھی اسی قسم کے ہوتے ہیں۔ انسان کے نفس اور قوتِ ارادی کا جسم پر اس قدر گہرا اثر پڑتا ہے جسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ فیشن، مثلاً پندرھویں اور سولھویں صدی میں یورپ خصوصاً ہالینڈ کی عورتوں میں موٹے ہونے کا فیشن اور جنگِ عظیم کے بعد دُبلے ہونے کا فیشن انسانی جسم کی ساخت کو بہت کچھ بدل دیتا ہے۔ قرونِ وسطیٰ میں ایران یا چین میں مردوں اور عورتوں کی خوبصورتی کا جو معیار تھا اس نے ان کی صورت اور جسم کی ہیئت کو بدل دیا۔ اسی

طرح جن قوموں میں جسم کا اوپر کا حصّہ کھلا رہتا ہے اُن کے سینے ان لوگوں کے مقابلے میں جو سینے اور کندھوں کو ڈھکا رکھتے ہیں زیادہ تنے ہوئے اور زیادہ اچھی حالت میں ہوتے ہیں۔ اس کا اثر پھیپھڑوں پر اور سارے نظامِ تنفس پر پڑتا ہے۔ چنانچہ سارے جسم کو ڈھکنے کے طریقے نے جو انسان نے اصل میں منطقۂ بارده کے شدید موسم سے مجبور ہو کر اختیار کیا تھا اس کے جسم کو بہت سخت نقصان پہنچایا۔ پھر یہ اور غضب ہوا کہ کل خانہ بدوش گلہ بانوں میں اسی قسم کا لباس پہننے کی رسم ہوگئی جو سارے جسم کو ڈھک لیتا ہے اور جب ان لوگوں نے آگے چل کر معتدل اور گرم ملکوں میں وسیع علاقے فتح کیے تو ان کے غریب باشندوں میں اپنا منطقۂ بارده کا لباس زبردستی رائج کر دیا۔ جو لباس قطب شمالی کے علاقے کے لیے مضر مگر ضروری تھا وہ گرم ملکوں کے لیے اور زیادہ مضر اور بالکل غیر ضروری تھا لیکن فاتح قوم کی نشانی کے طور پر اختیار کر لیا گیا۔ یہ عمل صریحی طور پر مہمل تھا اس لیے آہستہ آہستہ بتدریج وقوع میں آیا۔ قدیم یونان کے لوگ جنھوں نے دنیا کو خوبصورتی اور تندرستی کی قدر کرنا سکھایا انھیں شمالی حملہ آوروں کی نسل سے تھے لیکن انھوں نے اپنی پیشرو منوئی قوم کا سادہ اور خوشنما لباس اختیار کیا جو صرف آدھے جسم کو ڈھکتا تھا۔ وہ اپنے "جمنازیم" میں جسم کی صحت مند اور ہم آہنگ نشو و نما کا خاص انتظام کرتے تھے اور جمنازیم لفظ "جمناس" سے نکلا ہے جو "ننگے" کے معنی میں آتا ہے۔ یہی حال قدیم اہلِ روما، اہل مصر اور اہلِ ہند کا تھا جنھوں نے تاریخی زمانے میں بڑی بڑی

تہذیبوں کی بنا ڈالی۔ لیکن حضرت عیسےٰ کے بعد ہجرت عامہ کے زمانے میں شمالی قوموں کے نئے حملوں نے اس آرام دہ خوشنما نیم پوش "لباس" کو جو روم، ایتھنس، اسکندریہ، عرب، شمال مشرقی افریقہ اور ہندستان جیسے تہذیبی مرکزوں میں رائج تھا مٹا دیا۔ ان "مہذب قوموں" کا جسمانی انحطاط جو اُن میں اور ابتدائی قوموں یا خود ان کی تہذیب کے بانیوں میں، ما بہ الامتیاز ہے زیادہ تر اُسی کا نتیجہ ہے کہ منطقۂ باردہ کے خانہ بدوش گلہ بانوں نے ان کے مُلک کو فتح کر کے انھیں اپنا سارے جسم کو ڈھکنے والا لباس پہننے پر مجبور کیا۔ ہمارا نفسِ مطلب سے ہٹ کر ان باتوں کی طرف اشارہ کرنا کچھ بے جا نہیں ہے اس لیے کہ ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ موجودہ انسانی تمدن اور خود ہماری روزمرہ زندگی کے بعض اہم عناصر تاریخِ علم الاقوام کی رو سے خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے ماخوذ ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ قوموں کے جو اثرات ایک دوسرے پر پڑے ان سے بہت سے واقعات کی معقول توجیہہ میں مدد ملتی ہے ورنہ یا تو ہم ان واقعات کو سمجھ ہی نہ سکتے یا ان کی توجیہہ "فیشن" کے لفظ سے کرتے، جس کے دراصل اس وقت تک کچھ معنی نہیں جب تک یہ نہ بتایا جائے کہ اس فیشن کے رائج ہونے کے کیا وجوہ ہیں۔

اب ہم خانہ بدوش گلہ بانوں کی ابتدائی تہذیب کے مادّی پہلو کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں آگ پیدا کرنے کے اس مخصوص طریقے کو نظر انداز نہیں کرنا چاہیے جو سب سے پہلے ان ہی لوگوں نے ایجاد کیا تھا یعنی چقماق کو رگڑ کر آگ نکالنا۔ ظاہر

ہے کہ یہ ایجاد منطقۂ باردہ کے طبعی حالات کا نتیجہ تھی، یہاں سوکھی لکڑی دستیاب نہیں ہوتی تھی اس لیے اس طرح کام چلانا پڑا۔ ان گلہ بانوں کے ہاں آگ پیدا کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی تھا کہ ایک خاص قسم کی چھوٹی چھوٹی کمانیں بنائی جاتی تھیں اور ان پر لکڑی کے تبر ایک دائرے کی شکل میں رگڑے جاتے تھے یہاں تک کہ وہ جل اٹھتے تھے۔

خانہ بدوش گلہ بانوں کی معاشرتی تنظیم کی بنیاد اس امر پر تھی کہ ان کی زندگی جانوروں کے بڑے بڑے گلوں سے وابستہ تھی۔ مشترکہ خاندان کا نظام سب سے پہلے ان ہی کے ہاں قائم ہوا۔ انھیں سارے گھر بار کے ساتھ لمبے لمبے فاصلے طے کرنے پڑتے تھے۔ اس کے لیے کُل افرادِ خاندان کی خدمات یکساں ضروری تھیں اور اسی کی بدولت ان میں آپس میں زیادہ ربط پیدا ہو گیا۔ پدری وراثت جو اس مشترکہ خاندان میں رائج تھی گلہ بانی کی زندگی کا لازمی نتیجہ نہیں کہی جا سکتی۔ اسے ایک تاریخی واقعے کی حیثیت سے تسلیم کر لینا چاہیے۔ لیکن اس کی وجہ کے متعلق بحث کی جا سکتی ہے۔ خود اولیں تہذیب میں مردوں کے سپردِ غذا کے مہیا کرنے کا تخریبی پہلو یعنی جانوروں کا شکار تھا اور عورتیں پودوں کی پرداخت کے مادری فرائض انجام دیتی تھیں۔ مادری تہذیب میں زراعت کی ایجاد اور ٹوٹمی پدری تہذیب میں شکار کی ترقی کی توجیہہ آسانی سے اس طرح ہو سکتی ہے کہ عورتوں کا قدرتی رجحان پودوں کی پرداخت اور مردوں کا جانوروں کے شکار کی طرف تھا۔ لیکن جانوروں کے گلوں

کو سدھانا اور پالنا شکار سے کہیں زیادہ مشکل ہے، اس کے لیے جانوروں کو اچھی طرح سمجھنا اور ان سے دلی محبت رکھنا ضروری ہے۔ بغیر ضبطِ نفس، صبر اور واقفیت کے کوئی شخص جانوروں کے بڑے بڑے گلّوں کو قابو میں نہیں رکھ سکتا۔ محض جسمانی طاقت یا جانوروں کو پکڑنے کی قابلیت سے کام نہیں چلتا۔ ایک اچھا گلہ بان یقیناً ایک کامیاب شکاری سے بہتر اور برتر اوصاف کا مالک ہوتا ہے۔ جو شخص سینکڑوں اور ہزاروں جانوروں کو خطرے اور قحط سے بچاتا ہے اس میں کچھ نہ کچھ مادرانہ شفقت ضرور ہوتی ہے۔ ممکن ہے کہ مادری تہذیب کے جو عناصر شمال مشرقی سائبیریا میں یقیناً موجود تھے اور جن کا ہم نے اسکیمو قوم کے سلسلے میں ذکر کیا ہے ان ہی کی بدولت شمالی ہرنوں کو پالنے کی ابتدا ہوئی ہو۔ لیکن آگے چل کر مردوں نے جن میں ہمیشہ سے جانوروں سے دلچسپی تھی اور جن میں تنظیم کا خلقی مادّہ موجود تھا جانوروں کو سدھانے اور پالنے کا سارا کام اپنے ذمّے لے لیا ہوگا۔ بہر حال مویشی کی مالک عورتیں نہیں بلکہ مرد تھے۔ اور ملکیت خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں زیادہ اہم ہوگئی تھی۔ دوسری ابتدائی تہذیبوں میں ذاتی املاک صرف اپنے بنائے ہوئے اوزار تک محدود ہے لیکن یہاں اس میں پالتو جانور بھی شامل ہیں۔ سینکڑوں جانوروں کا گلہ کوئی معمولی املاک نہیں اسے محض اتفاق ہی نہیں سمجھنا چاہیے کہ Capitalism. (سرمایہ داری) لاطینی لفظ Capnt, سے مشتق ہے جس کے معنی "سر" کے ہیں اور اُس سے مراد جانور کا سر ہے جو سرمایہ داری کی جڑ ہے۔ اصل میں بڑے بڑے گلّوں کے مالک سب

سے پہلے سرمایہ دار تھے۔ انھیں اپنی دولت اور قوّت کا بڑا احساس تھا۔ ان کے قبضے میں سینکڑوں جانوروں کی جان تھی اور وہ ان کے لیے چراگاہیں مہیّا کرتے تھے۔ انھیں جانوروں پر خود ان کی اور خاندان کے کمزور افراد کی غذا منحصر تھی۔ ان حالات کا لازمی نتیجہ تھا کہ مشترکہ خاندان کے سردار نے جو بڑے بڑے گلّوں کا مالک بھی تھا، دنیا میں پہلی بار یہ دعویٰ کیا وہ سارے خاندان کی جانوں کا مالک ہے۔ ملکیت کی خواہش جب ایک بار پیدا ہو جائے تو وہ صرف مادّی چیزوں تک محدود نہیں رہتی۔ وہ زبردست "سرمایہ دار" جو ہزاروں جانوروں کا مالک ہے اور افراد خاندان پر حکومت کرتا ہے چاہتا ہے کہ ان کے جسم و جان کا بھی مالک بن جائے۔ بچے بلا شرکتِ غیرے اُسی کی مِلک ہوں، اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے نہ صرف عورتیں بلکہ بن بیاہی لڑکیاں بھی قیدیوں کی طرح نگرانی میں رکھی جانے لگیں اور سب سے بڑے لڑکے کو خاص اہمیت حاصل ہو گئی جس سے اس دستور کی بنیاد پڑی کہ باپ کا وارث سب سے بڑا لڑکا ہو۔ "ڈاکے کی شادی" یعنی دُلھن کو زبردستی پکڑ کر لے جانا بھی گلہ بانوں کی ایک خصوصیت ہے۔ آگے چل کر جب کسی قدر امن کا زمانہ آیا تو یہ رسم بدل گئی اور دُولھا دُلھن کے بدلے اس کے باپ کو کچھ مویشی دینے لگا۔ "دوشیزگی کا امتحان" جس میں پورا نہ اُترنے سے شادی منسوخ ہو جاتی ہے، یہ ظاہر کرتا ہے کہ مرد عورتوں کو اپنی جائداد سمجھتے تھے اور اس بات کا اطمینان کرنا چاہتے تھے کہ ان کے بچّے جو ان کی املاک کا ایک جُز ہیں انھیں کے نطفے سے ہوں۔ بچّوں کی ملکیت کے اس تصوّر سے

جس کے مطابق بچّوں سے محبّت خود ان کی خاطر نہیں کی جاتی بلکہ اس رشتے کی وجہ سے جو ان میں اور ان کے باپ میں ہے ایک نئی چیز پیدا ہوئی جسے انسان اس سے پہلے جانتے بھی نہ تھے، یعنی خون کے رشتے کا احساس، حقیقی رشتے داروں کی آپس میں محبّت اور غیروں سے نفرت۔ اس رجحان کی محرک یقیناً وہ مخالفت تھی جو ایک خاندان کو دوسرے سے گلّے کے مالک کی حیثیت سے ہوا کرتی تھی اس لیے کہ ہمیشہ یہ ڈر لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ اس کی چراگاہ پر قبضہ نہ کر لے۔ اس طرح شادی خاندان کی معاشی اور سیاسی مصلحتوں کا ایک اہم جز بن گئی۔ اوّلین تہذیب میں یہ ایک محض ذاتی معاہدہ تھا جو دو شخصوں کی باہمی محبّت پر مبنی ہوتا تھا۔ اب وہ ایک معاشی اور سیاسی معاملہ ہو گیا جس کے ذریعے سے ایک خاندان کی لڑکی دوسرے خاندان کی رُکن بنائی جاتی ہے۔ لڑکی کی ذات کی مطلق کوئی اہمیت نہیں سمجھی جاتی۔ اُسے اپنے خاندان سے کوئی تعلق نہیں رہتا اور شوہر کے خاندان میں بالکل کھپ جانا پڑتا ہے۔ اس کی پُرانی شخصیت کا مٹ جانا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اُسے اپنا خاندانی نام بلکہ کبھی کبھی اپنا ذاتی نام بھی بدلنا پڑتا ہے۔ دُلھن کو دولھا کے گھر میں آگ کے گرد پھرانے کی رسم اس معاملے کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے کہ اس کا رواج خانہ بدوش گلّہ بانوں کی کل قوموں میں ہے۔ چونکہ ماں بیٹی کا تعلق اوّلین تہذیب کے زمانے سے کل قوموں میں خاص طور پر گہرا ہوتا ہے اس لیے لڑکی کو دولھا کے گھر جا کر رہنے پر آمادہ کرنے کے لیے نہ جانے کتنے جبر و ظلم اور کن مصنوعی اصولوں سے کام

لینا پڑا ہوگا۔ شادی کے موقع پر دُلھن کے رونے کی رسم جو اب خانہ بدوش گلہ بانوں کے علاوہ ترقی یافتہ قوموں میں بھی رائج ہے، اسی زمانے کی یادگار ہے۔ اسی طرح ہر گھر میں الاؤ جلانے کا دستور، جو ترقی یافتہ گلہ بانوں خصوصاً گھوڑوں پر سوار ہونے والی قوموں میں رائج ہے، یقیناً ان ہی قدیم تصوّرات سے تعلّق رکھتا ہے۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں سرمایہ داری کی ابتدا کا ہم ذکر کر چکے ہیں۔ ان کا سرمایہ محض جانوروں کے گلّوں پر مشتمل ہے اور یہ ایسی چیز ہے جو قحط اور متعدی بیماریوں سے ضائع ہو سکتی ہے، اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم جو چند ہفتے یا چند دن پہلے بہت دولت مند تھی اپنی ساری املاک کھو بیٹھی اور افلاس کا شکار ہو گئی۔ اب اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ یا تو فاقوں مر جائے یا دوسرے گلّوں کے مالک کی خدمت کرے۔ اس طرح اس تفریق کی بنیاد پڑی جو اب تک انسانی معاشرت میں معدوم تھی۔ انسانوں کا فرقِ مراتب قابلیت کی بنا پر نہیں بلکہ ملکیت کی بنا پر، ایک ہی جماعت میں بعض لوگوں کا غلام اور بعض کا آزاد ہونا ان ہی معاشی حالات کا نتیجہ ہے جو گلہ بانوں کی تہذیب سے مخصوص تھے۔ اس تہذیب کی ابتدائی منزلوں ہی میں کئی دولت مند اور آزاد خاندان ایک دوسرے سے وابستہ نظر آتے ہیں۔ ہم انھیں خاندانوں کے مجموعے یا جرگے کہہ سکتے ہیں مگر یہ یاد رکھنا چاہیے کہ وہ ٹوٹمی جرگوں سے بالکل مختلف ہیں۔ ٹوٹمی جرگے کی بنیاد فرضی رشتے پر قائم ہے اور اس میں بیرونی شادی کا رواج ہے۔ گلہ بانوں کے جرگوں کی بنیاد خون کے رشتے پر ہے

اور اس میں اندرونی شادی رائج ہے۔ جرگوں کا یہ نظام جس میں جرگے کے باہر شادی کی ممانعت تھی اس سے پہلے قائم ہوا جب خانہ بدوش گلہ بانوں کی گھوڑوں پر سوار ہونے والی قوموں نے پدری تہذیب کی ریاستوں کی بنیاد ڈالی۔ اس ریاست کا موجود نہ ہونا گلہ بانوں کی حقیقی ابتدائی یعنی قبل تاریخی تہذیب کی خصوصیت ہے۔ ان کے ہاں لڑکوں اور لڑکیوں کی محرمی کی رسمیں بھی نہیں ہوتیں۔ یہ ان میں اور دوسری ابتدائی تہذیبوں (نیز اولین تہذیب) میں بہت بڑا فرق ہے۔ ان کی گھوڑوں پر سوار ہونے والی قوموں میں خاندان کا سردار عورتوں اور اپنے سے کم عمر کے مردوں کی جان کا مالک ہوتا ہے گویا خاندان میں مطلق العنان حکومت کا رواج ہے۔ بہ خلاف اس کے جرگوں میں مختلف خاندانوں کے سردار مل کر حکومت کرتے ہیں۔ یہ سب چیزیں مردوں کی تنظیمی قابلیت، بڑی بڑی جماعتوں کے انتظام اور بلند تصورات کے لیے سازگار ہیں لیکن اسی کے ساتھ ان کی وجہ سے سردار خاندان کے علاوہ دوسرے افراد کی شخصی آزادی کو نقصان پہنچتا ہے۔ اس تہذیب کے مذہب میں بھی وہی وسعت اور بلندی اور اسی کے ساتھ استبداد کا تصوّر پایا جاتا ہے جس میں فرد کی آزادی اور عظمت سے نہ صرف چشم پوشی کی جاتی ہے بلکہ اسے پامال کر دیا جاتا ہے۔ عموماً آسمان کو خدا مانتے ہیں۔ ان کی زندگی اور موت، دولت اور افلاس ہر چیز اس پر منحصر ہے کہ گرمیوں میں بارش کتنی ہوتی ہے اور جاڑے میں سردی کی شدّت کا کیا حال رہتا ہے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں کہ شاندار وسیع آسمان کو خانہ بدوش گلہ بان خدا سمجھنے لگتے ہیں اور

ان کے خدا کے تصور میں خوف اور دہشت کا عنصر غالب ہوتا ہے۔ خدا کے مقابلے میں بدی کی ایک غیر مرئی قوت یعنی شیطان کا تصور بھی اسی تہذیبی دائرے میں پیدا ہوا ہے۔ یہ بات جتنی اہم ہے اور اس سے انسانی فطرت اور تاریخِ تمدن کی جس قدر گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے اس کا لوگوں کو عام طور پر پورا اندازہ نہیں ہے۔ معصوم اولین تہذیب میں انسان اس کا قائل تھا کہ خدا خیرِ محض ہے اور دُنیا پر رحم و کرم کی قوتیں حکومت کرتی ہیں۔ یہی تصور کسی قدر ترمیم کے ساتھ اور طرح طرح کے توہمات میں آلودہ مادری اور ٹوٹمی ابتدائی تہذیبوں میں بھی پایا جاتا ہے جو اولین تہذیب سے نکلی ہیں۔ لیکن اس اصل کی تیسری شاخ یعنی خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب اس معاملے میں بالکل مختلف ہے۔ اس نے تنظیم، قوّت اور دولت میں بہت کچھ ترقی کی۔ لیکن اس کے عوض اخلاقی نقطۂ نظر سے اسے بہت بڑا نقصان برداشت کرنا پڑا۔ انسانوں میں باہم اخوت کا احساس جاتا رہا۔ عورتوں کے حقوق اس سے بھی کم ہوگئے جتنے پدری ٹوٹمی تہذیب میں تھے۔ وہ مردوں کی جائداد بن کر رہ گئیں۔ مگر اسی کے ساتھ مردوں نے بھی اپنی "قدرتی عظمت" کھودی اور ایک دوسرے کا تابعدار بن گیا۔ ان کی قدر اب ان کے جوہرِ ذاتی کی بنا پر نہیں ہوتی تھی بلکہ حصولِ دولت کی بنا پر۔ اس میں شک نہیں کہ اس دولت کا حاصل کرنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ جانوروں کے بڑے بڑے گلّوں کو قابو میں لانے اور پالنے کے لیے مستعدی، قوّت اور معلومات کے علاوہ صبر و ضبط اور کسی قدر مادرانہ شفقت کی بھی ضرورت ہے۔ انھیں گلّوں

سے لوگ قوی اور دولت مند بنتے تھے اور جب یہ قحط میں فاقوں مرجاتے تھے تو ان کے مالکوں کو دوسروں کی غلامی کرنی پڑتی تھی۔ لیکن دنیاوی قوّت نے انسانوں کی بُری خصلتوں یعنی غرور، شقاوت اور ظلم کو اُبھارا۔ شیطانی قوّت کا عقیدہ جو ایزدی، محبّت اور نور کی حریف ہے اسی تہذیبی دوَر میں پیدا ہوا۔ جب انسان کے اندر بدی اور تخریب کی قوتیں پیدا ہوئیں۔

اولین تہذیب کا پاک وحدانیت کا عقیدہ یہاں بھی دوسرے تہذیبی دائروں یعنی مادری اور ٹوٹمی تہذیب کی طرح مسخ ہو گیا۔ ٹوٹمی تہذیب میں مظاہر فطرت مثلاً رعد، برق، بادو باراں اور خود زمین کو دیوی دیوتا مان لیا گیا۔

دُنیا کی تخلیق کی کہانیاں ان کے ہاں بھی ہیں اور اولین تہذیب کی کہانیوں سے بہت مشابہت رکھتی ہیں خصوصاً منطقۂ باردہ کے علاقے میں۔ ہمیں اولین تہذیب میں نظر آیا تھا کہ کسی افسانوی جانور نے زمین کو پانی سے نکالا۔ یہ خیال خانہ بدوش گلہ بانوں کی کہانیوں میں بھی بار بار آتا ہے۔

آسمانی دیوتا کے آگے قربانیاں عام ہیں۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی سب سے قدیم قربانی یہ ہے کہ ایک خوبصورت سفید جانور چُن کر دیوتا کے نام پر چھوڑ دیا جاتا۔ اس تہذیب کی حامل یا اس سے علاقہ رکھنے والی قوموں میں قربانی کے جانور کا گلا گھونٹنے اور کہیں کہیں خون بہانے کا دستور بھی ہے۔ لیکن قربانی کے یہ طریقے آگے چل کر بیرونی اثرات خصوصاً مادری تہذیب کے اثر سے وجود میں

آئے۔ ہم پانچویں باب میں کہہ چکے ہیں کہ مادری تہذیب میں چاند کے اوتار کی ذاتی قربانی اور زرخیزی کا تصور خون کی قربانی کے ساتھ وابستہ ہے۔

آباو اجداد، خصوصاً افسانوی سورماؤں کی پرستش اور دودھ (خصوصاً گھوڑے کے دودھ) کی بنی ہوئی نشّی چیزوں کا استعمال خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی بعد کی منزلوں کی خصوصیت کہی جا سکتی ہے۔

اس تہذیبی دائرے میں پہلی اور بعد کی منزلوں کے فرق کی طرف ہم نے اس تہذیب میں جا بجا اشارہ کیا ہے۔ ان منزلوں کی ترتیب جانوروں کی ان اقسام کے اعتبار سے ہے جن پر خانہ بدوش گلہ بانوں کے معاشی نظام کی بنیاد رکھی گئی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ جانوروں کو پالنے کی ابتدا منطقۂ باردہ شمالی میں چھوٹے چھوٹے ہرنوں سے ہوئی ہوگی۔ ان ہرنوں کا گوشت اور دودھ استعمال کیا جاتا تھا اور ان سے پھسلواں تختوں کے کھینچنے کا کام لیا جاتا تھا جیسے کہ ان سے پہلے کتوں سے۔ دوسری منزل یہ تھی کہ بڑے بڑے ہرن پالے جانے لگے جن کی پیٹھ پر مرد اور عورتیں سوار ہو سکتی ہیں۔ چھوٹے ہرنوں کے پالنے کا رواج اب بھی سموئی، کویاک اور چوچی قوموں میں اور بڑے ہرنوں کے پالنے کا سطح مرتفع سایان کی سویٹ قوم تنگوسیوں، جنوبی سموئیوں اور لیپ لین کے باشندوں میں موجود ہے شمالی امریکا کے اسکیمو ہرنوں کا شکار تو کر سکتے تھے مگر ان کا پالنا نہیں جانتے تھے۔ یہ انھوں نے حال ہی میں لیپ لین والوں اور

دوسری یوریشائی ہرن پالنے والی قوموں سے سیکھا ہے جنھیں کنیڈا کی حکومت نے اسی مقصد کے لیے امریکا بلوایا تھا۔ یہاں علم الاقوام کا مطالعہ کرنے والوں کے سامنے اس بات کی زندہ مثال موجود ہے کہ کوئی عملی فن مثلاً یہی ہرنوں کا سدھانا اور پالنا سیکھتے وقت ایک قوم دوسری قوم کی ضمنی اور غیر ضروری چیزیں بھی اختیار کر لیتی ہے۔ امریکا کی اسکیمو قوم نے ہرنوں کی لگام ان کے کانوں کے نشان، آرائشی سامان اور پھسلواں تختوں کی ہو بہو وہی شکل اور وضع اختیار کی ہے جو یوریشیائی قوموں میں رائج تھی۔ اس سے نظریۂ نشر کی تائید ہوتی ہے جس پر عالمگیر تہذیبی دائروں کا تصوّر مبنی ہے اور یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ لوگ غیر قوم کی تہذیب کی اصلی اور ضمنی، ضروری اور غیر ضروری چیزوں میں تمیز نہیں کر سکتے۔ یا تو وہ سب کچھ رد کر دیتے ہیں یا سب کچھ اختیار کر لیتے ہیں، یہ بہت کم ہوتا ہے کہ کسی بیرونی تہذیب کی قابلِ عمل، کار آمد اور اچھی باتیں اختیار کر لی جائیں اور محض آرائشی ناقابلِ عمل اور فضول باتیں جو عموماً مضر ثابت ہوتی ہیں چھوڑ دی جائیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہرنوں کا پالنا اسکیمو قوم کے لیے جو پہلے صرف ان کا شکار کرنا جانتی تھی، ترقی کا قدم ہے۔ لیکن گلا گھونٹ کر قربانی کرنا، خاندان کے لوگوں کے جسم پر جانور کے خون کے نشان لگانا، گلہ بان قوموں کے سارے مذہبی توہمات اور معاشرتی تصورات خصوصاً سردار خاندان کی مطلق العنانی اور عورتوں کی پست حالت ہرنوں کے پالنے کا لازمی اجزا نہیں ہیں۔ ان میں سے ایک چیز لے لینی چاہیے تھی اور باقی چیزوں کو چھوڑ دینا چاہیے تھا۔ لیکن

مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ جو لوگ دوسری تہذیبوں کو اختیار کرتے ہیں وہ اس قسم کے انتخاب سے کام نہیں لیتے۔ زیادہ تر تو یہ ہوتا ہے کہ اپنی روایات کی محبت غیر تہذیب کی تقلید سے روکتی ہے لیکن جب کسی چیز میں غیر قوموں کی معاشی یا فنی برتری تسلیم کرلی جائے تو اس کی نقل کرتے وقت تنقید کا جذبہ بالکل غائب ہوجاتا ہے۔ بظاہر انسانوں کے لیے یہ ناممکن ہے کہ وہ غیروں کی تقلید کے ساتھ ساتھ تنقید سے بھی کام لیں۔ اس کی مثالیں اگر ہیں بھی تو بہت شاذ۔

ہرنوں کی پیٹھ پر سوار ہونے کا رواج جنوبی سائبیریا کی اکثر قوموں میں ہے۔ غالباً ابتدا میں وہ بچّوں کو چھوٹے شمالی ہرنوں پر بٹھایا کرتے ہوں گے پھر رفتہ رفتہ خود بڑے ہرنوں پر سوار ہونے لگے۔

اس بات کی کہ ہرنوں کا پالنا دوسرے بڑے جانوروں کے پالنے سے پہلے شروع ہوا تھا، علم الاقوام، علم حیوانات اور جغرافیہ کی شہادتوں کے علاوہ تاریخی شہادت بھی موجود ہے۔ مصر کے شہر میمفس میں ایک واز[1] پر ایک عورت اور ایک شمالی ہرن کی تصویر بنی ہے۔ یہ ہرن صریحاً پالتو ہے اس لیے کہ اس کا دودھ استعمال کیا جارہا ہے۔ ارسطو نے جنوبی روس کی سرماشی قوم کے ذکر میں بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ شمالی ہرنوں کے پالنے میں جو آسانی ہے اور انھیں پالنے والی قوموں میں جو سادگی نظر آتی ہے اُس سے بھی اس نظریے کی تائید ہوتی ہے کہ ہرنوں کا پالنا پہلے شروع ہوا۔ ہرنوں کو دانتوں سے خصّی کرنے کا دستور اور ایک خاص قسم کی لگام کا استعمال

---

[1] چینی وغیرہ کا بڑا ظرف جو آرائش کے لیے کمرے میں رکھتے ہیں۔

جو سائبیریا کی کتّے پالنے والی قوموں سے مخصوص ہے کہ کتّوں اور ہرنوں کو پالنے کی درمیانی کڑی ہے۔

گھوڑوں کے پالنے کا قدیم طریقہ اور اس کے متعلقات جو شمالی ایشیا میں رائج تھے (اور ایک حد تک اب بھی ہیں) ہرنوں کے پالنے سے ماخوذ ہیں، جیسے ہرنوں کو پالنے کا طریقہ سائبیریا میں کتّوں کے پالنے سے ماخوذ ہے۔ کتّا وہ جانور ہے جس کا پالنا سب سے زیادہ آسان ہے۔ وہ اپنی فطرت کے تقاضے سے ابتدائی انسانوں کی جھونپڑیوں کے گرد منڈلایا کرتا ہے، کھانے کی جو چیز مل جاتی ہے اُسے لے بھاگتا ہے اور اپنی خوشی سے انسان کی اطاعت اختیار کرتا ہے۔ کتّوں کو پالتو بنانے اور ان سے پھسلواں تختوں کو کھینچنے کا کام لینے میں کوئی دقّت نہیں ہوئی ہوگی۔ اسی طرح شمالی ہرن بھی، جب انھیں مچھّروں کی تکلیف انسانوں کے الاؤ کے پاس پناہ لینے پر مجبور کرتی تھی، آسانی سے قابو میں آجاتے ہوں گے لیکن ہرن زیادہ طاقتور ہوتا ہے، اس کا گوشت زیادہ مزے دار ہوتا ہے اور اس کی مادہ اتنا دودھ دیتی ہے کہ بچّے کو پلانے کے بعد مالک کے لیے بھی بچ رہتا ہے، اس لیے ہرنوں کو پالنا یقیناً بہت بڑی ترقی تھی۔ خصوصاً اس لحاظ سے کہ ان کے بڑے بڑے گلّے پالے جا سکتے تھے۔ ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ بڑے بڑے گلّوں کے پالنے کے، پالنے والوں کی ساری تہذیب پر کیا کیا اثرات پڑے اور یہ بھی بتا چکے ہیں کہ پہلے بچّوں نے چھوٹے شمالی ہرنوں پر سوار ہونا شروع کیا اور پھر بڑی عمر کے لوگ جنوب کے بڑے ہرنوں پر سوار ہونے لگے اور اس طرح

کم وقت میں زیادہ فاصلہ طے کرنے لگے۔ اس کے بعد دوسرا قدم اٹھانا یعنی گھوڑے کی سواری شروع کرنا قدرتی بات معلوم ہوتی ہے۔ پھر انھیں بھی یہ کام آسان نہیں تھا جتنا پہلی نظر میں معلوم ہوتا ہے۔ اصلی جنگلی گھوڑا اب تک جنوبی سائبیریا میں پایا جاتا ہے۔ اس شریف اور آزاد جانور کو قابو میں لانا ہی سخت مشکل کام ہے جس کے لیے بہت بڑے تجربے، قابلیت اور معلومات کی ضرورت ہے۔ اس کا پالتو بنانا تو قریب ناممکن ہے۔ اس سے ہم اندازہ کر سکتے ہیں کہ خانہ بدوش گلہ بانوں کے لیے جو ہرنوں پر سوار ہونے کے عادی تھے، گھوڑوں پر سوار ہونا کتنی بڑی ترقی تھی۔ وحشیانہ جبر اور ظلم جو بدقسمتی سے آج کل کے تانگے والے جُتے ہوئے گھوڑوں پر کرتے ہیں جنگلی گھوڑے کے ساتھ چل ہی نہیں سکتا تھا۔ اُس وقت نہ گاڑی تھی اور نہ جُوا تھا۔ سوار کو گھوڑے کی ہمدردی اور اعتماد حاصل کرنا پڑتا تھا کہ جو کام جبر سے نہیں ہو سکتا تھا وہ خوشی سے کرائے۔ جس طرح آج کل شہسوار جبر اور سختی سے نہیں بلکہ صبر اور سمجھ اور بہت ہلکی سزاؤں سے کام لیتے ہیں، اسی طرح جو لوگ ابتدا میں گھوڑے کو قابو میں لائے تھے انھیں سُورماؤں کی اعلیٰ صفات یعنی سمجھ، صبر و تحمل، مستعدی اور استقلال سے کام لینا پڑا ہوگا۔ آج کل گھوڑوں اور ہرنوں کو پالنے والے جہاں جہاں پائے جاتے ہیں انھیں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفات سب سے پہلے ابتدائی ترکوں میں پیدا ہوئی ہوں گی جو جنوب مغربی ایشیا سے ہجرت کر کے شمال مشرق کی طرف جاتے ہوئے جنوبی سائبیریا پہنچے

ہوں گے۔ اس ہجرت کا سبب عموماً وہ خشک سالی سمجھی جاتی ہے جس نے یورپ کے برفانی عہد کے آخر میں ترکستان، بلوچستان راجپوتانہ، جنوبی ایران، عرب اور شمالی افریقہ کو ویران کر دیا ہوگا، جس کا صحرائے اعظم عہد متاخر حجری کی مصری تہذیب کے زمانے میں ایک سرسبز مرغزار تھا۔

خانہ بدوش گلہ بانوں کی اصلی تہذیب کے ابتدائی حاملوں میں گھوڑوں کو پالنے والے غالباً وہ قبائل ہوں گے جو یورال، التائی زبانیں بولتے تھے۔ ان کی تین جماعتیں اب بھی اپنے اصلی رنگ میں اور اپنے اصلی وطن کے آس پاس نظر آتی ہیں۔

(الف) یاکوت قوم جو اب شرقی سائبیریا میں وادیٔ لینا تک پہنچ گئی ہے، اباکان تاتار، تلوٹ اور تلنگیٹی قبائل جو اصلی گھوڑوں کو پالنے والے ہیں اور اصلی ترک بھی۔

بقیہ قوموں میں غیر تہذیبوں کا میل ہے اور دوسرے جانوروں خصوصاً بھیڑ اور بکری پالنے کا بھی رواج ہے۔ ان کی تفصیل حسبِ ذیل ہے:۔

(ا) یاکوت۔

(ب) کرغیزی ترکمان اور بحرِ اخضر کے علاقے کے تُرک۔

(ج) منگولی۔ ان میں حسبِ ذیل قبائل اس سلسلے میں قابلِ ذکر ہیں:۔

بیکال جھیل کے علاقے میں بریات، بیرونی منگولیا میں کلچا، وادیٔ ولگا میں کلموک اور اندرونی منگولیا میں ٹنگوٹ۔

(ب) اور (ج) میں جن قوموں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی ترقی یافتہ اور مخلوط تہذیب سے ایک تخصیصی تہذیب نے نشو و نما پائی جو ہرنوں کو پالنے کی سادہ زندگی سے اسی قدر مختلف تھی جتنی مادری تہذیب کی تیسری منزل پہلی منزل سے۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی یہ تخصیصی شکل گھوڑوں پر سوار ہونے والی جنگجو قوموں کی تہذیب ہے۔ جس طرح ہم نے مادری تہذیب کی پہلی منزل کی سادہ زراعت دوسری منزل کے دوئی کے طریقے اور تیسری منزل کی تخصیص میں فرق کیا تھا، اسی طرح یہاں بھی ہرنوں کو پالنے اور گھوڑوں کو پالنے کی منزلوں اور تیسری منزل یعنی گھڑ چڑھی جنگجو قوموں کی زندگی میں بھی فرق کرنا چاہیے۔ جیسے مادری تہذیب کی تیسری منزل کے آخر میں سب سے پہلی شہری ریاستیں مہنجو دارو، ہڑپا اور مشرق وسطی اور مشرق قریب کی اور ریاستیں قائم ہوئیں اسی طرح خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کی تیسری منزل یعنی گھڑ چڑھی جنگجو قوموں کی تہذیب نے بھی ان مادری ریاستوں کی بنیاد پر اپنی شاندار ریاستوں کی عمارت کھڑی کی۔

لیکن گلہ بانوں کی پدری ثانوی تہذیب کے حامل صرف ترک ہی نہیں تھے۔ ترکی منگولی قوموں کے اصلی وطن کے قریب ہی ہندی، یورپی اور حامی سامی زبانیں بولنے والی قومیں بھی رہتی تھیں۔ وسطِ ایشیا کے مرغزاروں میں جو کسی زمانے میں نہایت زرخیز تھے خانہ بدوش گلہ بانوں کی ان قوموں کا مسکن تھا جو زبان کے لحاظ سے ان تین جماعتوں میں تقسیم تھیں۔ غالباً ترکی منگولی

قوموں کا وطن اس علاقے کے شمال مشرق، ہندی یورپی قوموں کا
شمال مغرب اور حامی سامی قوموں کا جنوب میں تھا۔ ممکن ہے کہ
ان تینوں میں گلہ بانوں کی تہذیب کے ساتھ بیرونی تہذیبوں یعنی
ترقی یافتہ مادری اور ابتدائی ٹوٹمی تہذیب کا میل مختلف حد تک
ہوا ہو۔ لیکن وسطِ ایشیا کی ان تینوں بڑی قوموں کی بنیادی تہذیب
ایک ہی تھی۔ یہ نتیجہ ان کے عادات و خصائل کے مقابلے سے نکلا
جو علم الاقوام نے تاریخ تمدّن کی روشنی میں کیا۔ وسطِ ایشیا کی خشک
سالی نے ان تینوں قوموں کو اس پر مجبور کیا کہ اپنا وطن چھوڑ کر دوسرے
ملکوں میں ہجرت کریں۔ ان کی جنگی تنظیم، وہ فوقیت جو انھیں فوجی
نقطۂ نظر سے گھوڑوں پر بیٹھنے اور تیزی سے نقل و حرکت کرنے کی
وجہ سے حاصل تھی، وہ غرور اور خود پسندی جو مطلق العنان پدری حکومت نے
ان میں پیدا کردی تھی ان سب چیزوں کی بدولت انھیں مادری تہذیب کی شہری
ریاستوں پر فتح حاصل ہوئی جو تمدّن، علم، عقل اور دولت میں ان سے بڑھ کر
تھیں لیکن فوجی صفات میں ان کا مقابلہ نہیں کر سکتی تھیں۔ پھر بھی مفتوحوں
کی برتر تہذیب زندہ رہی گو وہ فاتحوں کے نام سے منسوب ہو گئی۔ فتح مند گلہ بانوں
کی زبان مذہب کی ظاہری شکل اور نام مفتوح ریاستوں کو اختیار کرنے پڑے
لیکن مفتوح قوموں کی حقیقی مذہبی روح ان کے علوم، مزاجی خصوصیات
اور ان کا سارا اندرونی نظام تھوڑے بہت ظاہری فرق کے ساتھ
بدستور باقی رہا۔ یہ بات اس سارے وسیع علاقے میں جو گھڑ چڑھی
جنگجو قوموں نے فتح کیا تھا نظر آتی ہے۔ چین، شمال مشرقی ایشیا اور
ایک حد تک مشرقِ قریب میں ترکی منگولی، ہندستان اور یورپ میں

ہندی یورپی اور وسطی مشرق اور شمال افریقہ میں حامی سامی قوموں نے مفتوح ملکوں کی تہذیب کو اختیار کر لیا۔ ان مفتوح ملکوں کی تہذیبوں میں جو زبردست فرق نظر آتا ہے اس کی توجیہہ اس معمولی فرق سے نہیں کی جاسکتی جو فتح مند گھڑ چڑھی قوموں کے آبا و اجداد میں تھا۔ اس فرق کی وجہ مفتوح قوموں کی تمدنی، مذہبی، لسانی اور مذہبی خصوصیات ہیں۔ سر جان مارشل نے بالکل صحیح بات کہی ہے کہ باوجود اس کے کہ سنسکرت اصل کی زبان (ہندستانی اور اُردو) جزیرہ نمائے ہند کے بہت بڑے حصے میں پھیلی ہوئی ہے، سنسکرت ناموں سے دیوتا اور عام باشندوں میں سے اکثر پکارے جاتے ہیں اور آریوں نے تین ہزار سال تک یہاں حکومت کی ہے۔ ہندستان کا موجودہ تمدن اب تک قبل آریائی عہد کی مادری شہری تہذیب سے (جو موہنجو دارو کی کھدائی سے ظاہر ہوئی ہے) زیادہ مشابہ ہے بہ نسبت ان خانہ بدوش آریوں کی تہذیب کے جنھوں نے ۱۵۰۰ ق۔م کے لگ بھگ اس ملک پر حملہ کیا تھا۔[۱۴] یہی بات چین، یورپ، یونان، مصر غرض دنیا کے کل تہذیبی مرکزوں کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جن سے ابتدائی تاریخی عہد میں تہذیب و تمدن کی روشنی پھیلی۔

اس سے مادری تہذیب کے حاملوں اور گھڑ چڑھی جنگجو قوموں دونوں کے شہری تمدن کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔ دونوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج تھا۔ اوّل الذکر نے اپنا خاص رسم خط ایجاد کیا اور آخر الذکر نے دوسروں سے لے لیا۔ یہاں ہم تاریخ کی سرحد پر پہنچ گئے

ہیں، اس لیے اس موضوع کو چھوڑ کر علم الاقوام کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ لیکن چونکہ عام طور پر جانوروں خصوصاً گھوڑوں کے گلّوں کا پالنا بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے اس لیے مناسب ہوگا کہ ہم کسی قدر تفصیل کے ساتھ بیان کردیں کہ اس کا رواج ساری دنیا میں کیونکر ہوا۔

سب سے پہلے پالتو گھوڑوں کا پتہ ۴۰۰۰ ق۔م کے لگ بھگ وسطِ ایشیا کے اس علاقے میں چلتا ہے جہاں شہر اناؤ واقع تھا۔ ایران کے شہر کش میں قدیم بادشاہوں کے جو مقبرے ہیں ان میں بعض آثار اس کے پائے جاتے ہیں کہ یہاں حضرت عیسیٰ سے کوئی ساڑھے تین ہزار سال پہلے پالتو گھوڑے موجود تھے۔ یہ غالباً وہی زمانہ ہے جو عراق عرب میں ایلم اور سوسا کا زمانہ تھا۔ عراق کے شمال مشرقی گوشے اور "اُر" کے علاقے میں گھوڑا سب سے پہلے ۲۰۰۰ ق۔م میں پہنچا۔ ایشیائے کوچک میں ہیٹی اور متھانی تو میں ۱۲۰۰ یا ۱۰۰۰ ق۔م کے لگ بھگ گھوڑے لائی ہوں گی۔ اسی زمانے میں آریوں نے ہندستان کی طرف ہجرت کی اور اسے فتح کرلیا ان کے ساتھ گھوڑا (اور ہتھیار بنانے کے لیے لوہے کا استعمال) ہندستان آیا۔ چین میں گھوڑا اس سے پہلے یا کم سے کم اسی زمانے میں پہنچا۔ عہد چُو (۱۱۵۰ تا ۷۰۰ ق۔م) کی یہ خصوصیت ہے کہ متعدد گھُڑ چڑھی قوموں نے چین پر حملہ کیا۔ اسکینڈینویا اور بقیہ یورپ کے لوگ عہد متاخر حجری سے جو یہاں مقابلتہً دیر میں شروع ہوا، گھوڑے سے واقف تھے۔ غالباً ہندستان کی طرح

یورپ میں بھی گھوڑا اور سنسکرت خاندان کی زبان کسی گھڑ چڑھی ہندی یورپی قوم کی ہجرت اور فتوحات کے ذریعے سے پہنچی ہوگی۔ لیکن چونکہ یورپ میں اس زمانے میں کوئی برتر تہذیب موجود نہیں تھی اس لیے ہندی یورپی خانہ بدوش گلہ بانوں کا اثر ہندستان کے مقابلے میں یہاں زیادہ مستقل اور دیرپا ثابت ہوا اور یہاں کے لوگوں کو مکمل تمدن کے درجے تک پہنچنے میں دیر لگی۔ ہندستان میں مہذب زندگی کی بنیاد وادیٔ سندھ کی قدیم مادری تہذیب کی شکل میں موجود تھی جس سے یورپ محروم تھا، مگر دوسری طرف اور تہذیبوں خصوصاً مغربی یورپ کی تہذیب کے اثرات اور طبیعی حالات مثلاً سمندر کے قرب اور نہایت عمدہ بندرگاہوں کے موجود ہونے کی وجہ سے یورپ میں ایک جداگانہ تمدن نے نشو و نما پائی جسے ہم جہاز رانوں کا مخصوص تمدن کہہ سکتے ہیں۔ گھڑ چڑھی قوموں میں بڑے بڑے فاصلے طے کرنے کا شوق پہلے سے موجود تھا۔ اب وہ بحری سفر کی طرف منتقل ہو گیا۔ ان لوگوں میں اور ابتدائی ماہی گیروں میں بہت فرق ہے جو بدھ کے زمانے سے پہلے انڈونیشیا میں پائے جاتے تھے۔ اسپینیوں، پرتگالیوں، ولندیزیوں، فرانسیسیوں اور آخر میں انگریزوں نے نئے ملک اور نئے راستے دریافت کرنے کے سلسلے میں وہ کارہائے نمایاں انجام دیے جن سے ایک عالمگیر تمدن کی بنیاد پڑی۔ یہ عمل زندگی میں ایک بالکل نئی چیز تھی اگرچہ اس کا تصور دنیا کے بڑے مذاہب مثلاً بدھ مت، مذہب عیسوی اور خصوصیت کے ساتھ اسلام میں پہلے سے موجود

تھا۔ اسے ہم پچھلے پانچ چھ سو سال کے عرصے میں انسانی تمدّن کی ایک بنیادی تبدیلی کہہ سکتے ہیں۔ اس بین الاقوامی تمدّن کے ساتھ ساتھ گھوڑا بھی ساری دُنیا میں پہنچ گیا۔ جنوبی امریکا کے بے آب و گیاہ میدانوں میں ۱۶۷۰ء میں گھوڑے کو یورپ والے دوبارہ لائے اور اسے یہ خطّہ ایسا پسند آیا کہ وہ پھر سے وحشی اور آزاد جانور بن گیا۔ شمالی امریکا، جنوبی افریقہ اور آسٹریلیا میں بھی گھوڑے کو یورپ ہی والے لائے، لیکن صرف شمالی امریکہ میں دیسی قوموں نے جو علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے دلچسپ ہیں، گھوڑے کی سواری اختیار کی۔ سیوکس قوم نے گھوڑوں کا پالنا اور ان پر سواری کرنا اسپینیوں سے سیکھا اور یہ ان میں اب تک موجود ہے۔ علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے ہم اس مثال سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ پہلے سیوکس قوم والے صرف کتّے پالا کرتے تھے گھوڑے سے وہ کئی ایسے کام لینے لگے جو کتّے سے لیا کرتے تھے۔ "ٹراوائے" ایک قسم کا ابتدائی پھسلواں تختہ ہے جسے کتّے آسانی سے کھینچ سکتے ہیں۔ اب وہ گھوڑوں سے کھنچوائے جانے لگے حالانکہ انھیں اس کے کھینچنے میں دقّت ہوتی ہے۔ اسی طرح قربانی بھی کتّے کے بجائے گھوڑے کی ہونے لگی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ایک زمانے میں ہرن پالنے والوں نے کتّے کا کام کس طرح ہرن سے لینا شروع کیا ہوگا اور مذہبی رسوم میں بھی کتّے کی جگہ ہرن کو دی ہوگی۔

انڈونیشیا میں گھوڑا اس وقت پہنچا جب ہندستان کے بدھ مت والوں نے وہاں اپنی نوآبادی قائم کی۔

آج کل بجز یاکوت قوم کے کل گھوڑے پالنے والی قومیں مویشی بھی پالتی ہیں لیکن یہ انھوں نے یقیناً بعد میں شروع کیا ہوگا۔

مویشی کا پالنا بظاہر گھوڑے کے پالنے سے زیادہ قدیم معلوم ہوتا ہے لیکن کچھ ضروری نہیں کہ ایسا ہی ہو۔ پالتو مویشیوں کے سب سے پرانے نشانات اناؤ میں ملتے ہیں اور طبقۂ اوّل (الف) سے تعلق رکھتے ہیں یعنی گھوڑوں کے آثار سے جو اسی مقام پر ملے ہیں زیادہ پرانے ہیں۔ ایڈورڈ ہان کا یہ خیال جس کا ہم پہلے ذکر کر چکے ہیں صحیح معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مویشیوں کا احترام اس وجہ سے کیا جاتا تھا کہ ان کے سینگ پہلی رات کے چاند سے مشابہت رکھتے ہیں، پھر رفتہ رفتہ انھیں پالنے اور ان سے کام لینے لگے۔ اس صورت میں پہلے مویشیوں کا احترام اور پھر ان کا پالنا کسی ترقی یافتہ مادری شہری تہذیب میں شروع ہوا ہوگا۔ دیومالا اور مذہب کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گائے کی پرستش سب سے پہلے مشرقِ قریب، عراق عرب، یا وادیٔ سندھ میں شروع ہوئی ہوگی لیکن بیل کی پرستش اس سے پہلے سے ہوتی تھی۔ مِنوی عہد کے کریٹ، قدیم مصر، مشرقِ قریب اور عراقِ عرب کے طوری تہذیب کے علاقے اور موہنجو دارو کے مذاہب میں بیل یا گائے کی جو اہمیت ہے وہ ظاہر ہے اس لیے ہم بلا تامّل یہ کہہ سکتے ہیں کہ گھوڑے کو پالنے سے پہلے گائے مذہبی عقائد کی وجہ سے پالی جاتی تھی اس کا آغاز مادری شہری ریاستوں میں ہوا تھا، اور مویشی سے عملی کام لینا آگے چل کر خانہ بدوش گلہ بانوں خصوصاً

گھڑ چڑھی قوموں کے حملے کے اثر سے شروع ہوا۔

مویشی کو پالنے کا رواج تیزی کے ساتھ جنوب مغرب کی طرف ہوا ہوگا اس لیے کہ اس کے نشانات مصر میں اس مقام پر جہاں بدار واقع تھا اور مشرقی اور شمالی افریقی مگالیتھی تہذیب کے سارے علاقے میں ملتے ہیں، جو ہندی یورپی اور سامی تہذیبوں سے پہلے گزری ہے۔ اسی طرح مشرقِ قریب میں مویشی کا پالنا ہندی یورپی تہذیب سے پہلے یافیٹی قوم میں جس کے پہلے آثار کوہِ قاف کے علاقے میں باقی ہیں، باسک قوم میں اور ایک حد تک البانیوں میں رائج رہا ہوگا۔ اسپین میں سانڈوں کی لڑائی اور البانیہ اور قفقاز میں اسی قسم کی رسمیں اس بات کا پتہ دیتی ہیں۔ مشرقی افریقہ میں بھی مویشی پالنے والوں کی مخصوص تہذیب اب تک باقی ہے۔ اس علاقے کی مسائی قوم جنوبی افریقہ کی ہریرو، سوڈان کی فُلبی اور مشرقی افریقہ کی ان سب قوموں میں جنھوں نے حامی زبان اور حامی تہذیب اختیار کی، اب تک مویشی کے پالنے کا ترقی یافتہ طریقہ اور اشرافی نظامِ معاشرت موجود ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ ان مویشی پالنے والی قوموں کی وارث ہیں جنھوں نے ان علاقوں کو فتح کر لیا تھا۔ یہ فاتح افریقہ میں اس وقت آئے تھے جب صحرائے اعظم کی زمین ایک بارونق چراگاہ تھی جہاں مویشی، ارنے بھینسے، ہاتھی اور ان کے علاوہ ہر قسم کے چھوٹے جانور کثرت سے پائے جاتے تھے، اس کا ثبوت آثارِ قدیمہ اور طبقات ارض کی تحقیقات سے ملتا ہے۔

آج تک مویشی پالنے اور کاشت کاری میں ایک معاشی اور معاشرتی رشتہ موجود ہے۔ مشرقی افریقہ میں کاشت کار کو عوام اور مویشی پالنے والوں کو اشراف سمجھا جاتا ہے۔ یہ بات قابلِ لحاظ ہے کہ اگرچہ مشرقی افریقہ کے مویشیوں کے سینگ بہت لمبے ہوتے ہیں لیکن معاشیات اور حیوانیات کے نقطۂ نظر سے یہ بہت عمدہ سمجھے جاتے ہیں۔ پروفیسر آمشلر نے جو ویانا کے زراعتی کالج میں پالتو جانوروں کے ماہر تھے، وادیٔ سندھ میں مہنجو دارو اور ہڑپا کی تہذیب میں اسی قسم کے پالتو مویشی کے نشانات پہچانے ہیں جیسے مشرقی افریقہ میں آج تک پالے جاتے ہیں۔ مشرقی افریقہ کے لوگوں اور جنوب مغربی ہند کی ان قوموں میں جنھوں نے وادیٔ سندھ کی روایات کو اب تک قائم رکھا ہے مادری تہذیب، صنعت و حرفت اور معاشرت کے لحاظ سے بہت مشابہت پائی جاتی ہے اور اس سے اس نظریے کی تصدیق ہوتی ہے کہ مشرقی افریقہ کے مویشی پالنے والوں کی تہذیب مہنجو دارو یا قریب کی کسی اور شہری ریاست کے مرکز سے پھیلی ہوگی۔

اس دلچسپ مسئلے پر جو ابھی تک حل نہیں ہوا ہے گہری نظر سے غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مویشی کو مذہبی رسموں کے لیے اور عملی مقاصد کے لیے پالنے میں بنیادی فرق ہے۔ اگرچہ آگے چل کر ان جانوروں سے بھی جو مذہبی رسوم کے لیے مخصوص تھے روزمرہ کے کام لیے جانے لگے لیکن اکثر صورتوں میں یہ فرق اب تک باقی ہے۔

مذہبی رسموں میں مویشی کا استعمال۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ مشرقِ قریب کی سب بڑی تہذیبیں جن میں کریٹ کی منوئی تہذیب اور مصری

تہذیب بھی شامل ہے اور اس کے علاوہ وادیٔ سندھ کی تہذیب یہ سب اس عنوان سے تعلق رکھتی ہیں۔ ہندستان کی موجودہ قوموں اور مشرقی افریقہ کے اشرافیت پسند مویشی پالنے والوں میں مویشی مذہبی رسوم اور عملی مقاصد دونوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ کوہ نیلگری کی ٹوڈا قوم میں بھی یہی صورت ہے۔ یہ لوگ ابتدائی قوم کے حامل تھے لیکن آگے چل کر انھوں نے کوئی دوسری تہذیب شاید مہنجوداڑو کی تہذیب جس کا مرکز ان کے اصلی وطن سے قریب تھا، اختیار کرلی۔ انڈونیشیا میں مویشی کے استعمال کی ایک اور صورت ہے، یہاں وہ میگالیتھی رسموں میں قربانی کے لیے بھی استعمال کیے جاتے ہیں اور ان کا گوشت بھی کھایا جاتا ہے۔ اسی طرح ہندی یورپی قوموں میں بھی مویشی کے یہ دونوں استعمال موجود تھے مگر شروع میں ان کے مذہبی استعمال پر زیادہ زور دیا جاتا تھا جیساکہ ان قوموں کی دیومالا سے معلوم ہوتا ہے۔ مزید تفصیلات کو چھوڑ کر ہم صرف اس بات کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ اس دلچسپ اور پیچیدہ مسئلے کی مکمل تحقیقات کرتے وقت مویشیوں کی مذہبی اہمیت کے علاوہ حسب ذیل عملی مقاصد میں جن کے لیے وہ استعمال ہوتے ہیں تفریق کرنی چاہیے:۔

(الف) ان کا دودھ پیا جاتا ہے۔

(ب) ان کا گوشت کھایا جاتا ہے۔

(ج) ان سے سواری یا بار برداری کا کام لیا جاتا ہے۔

(د) ان سے گاڑی کھنچوائی جاتی ہے۔

اونٹ پالنے والوں نے اپنی کوئی مخصوص تہذیب جیسی ہرن، گھوڑے اور مویشی پالنے والوں کی تھی، پیدا نہیں کی بلکہ ایک گھڑچڑھی قوم کی تہذیب کو ترقی دی۔ اونٹ کا پالنا سیان کی سطح مرتفع کے آس پاس شروع ہوا ہوگا اس لیے کہ وحشی اونٹ کا اصلی گھر یہی تھا۔ وحشی اونٹ دو کوہان کے ہوتے تھے اور اکثر پالتو اونٹ بھی ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن ایک کوہان کے اونٹ کی تصویر بھی عرب اور خصوصاً مصر میں دیواروں کی منبت کاری اور نقاشی میں نظر آتی ہے اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اونٹ کا پالنا کب سے شروع ہوا۔ اسلامی تہذیب کے ساتھ ساتھ اونٹ بھی بہت سے نئے ملکوں مثلاً ہندستان، اسپین، یونان، رومانیہ اور بلقان میں پہنچا۔ یہ عجیب بات ہے کہ جب کسی ملک سے اسلامی حکومت اٹھتی ہے تو یہ خوبصورت اور مفید جانور بھی وہاں سے رخصت ہو جاتا ہے حالانکہ وہ غیر مسلموں کے لیے بھی کچھ کم کارآمد نہیں۔ چنانچہ خاکسار مصنّف نے یونان کے شہر دلفی میں اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ جب ٹرکی کے ساتھ آبادی کا مبادلہ ہوا اور سب مسلمان ملک سے رخصت ہو گئے تو اونٹوں کا آخری قافلہ بھی جانے کے لیے تیار تھا۔ اسی طرح آسٹریلیا اور ایک حد تک امریکا میں بھی اونٹ کو عموماً عرب یا دوسرے مسلمان ہی لائے اور وہی اس کی حفاظت اور اس کی خدمت کرتے رہے۔ اونٹ بڑا جفاکش جانور ہے، وہ ہر طرح کی تکلیف اٹھا سکتا ہے اور مدّت تک بے کھائے پیے رہ سکتا ہے، پھر بھی اس سے کام لینے کے لیے بڑی ہمدردی اور صبر کی ضرورت ہے اور یہ صفات مشرقِ قریب

کے گھوڑے اور بھیڑیں پالنے والی مسلمان قوموں میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہیں۔ علم الاقوام کے نقطۂ نظر سے یہ بات بجائے خود دلچسپ ہے کہ جو قوم ایک خاص جانور کو پالتی اور اس سے کام لیتی ہے اس میں ایک خاص قسم کی مذہبی، تہذیبی اور معاشی زندگی پائی جاتی ہے۔ اور پھر اس سے یہ نظریہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ایک ہی جغرافی علاقے میں تہذیبی عناصر اور دوسری باتوں کے لحاظ سے وحدتِ عمل پائی جاتی ہے۔ جیسا کہ ہم تاریخ علم الاقوام کے باب میں کہہ چکے ہیں یہ نظریہ لیوفروبینیس نے پیش کیا اور اسی نے اس کے جغرافی پہلو پر زور دے کر تہذیبی دائرے کے نظریے کا ایک بنیادی اصول قائم کیا۔ بخلاف اس کے برونسلا مالیناؤسکی نے جو لندن یونیورسٹی میں علم الاقوام کا پروفیسر تھا، اس بات پر زور دیا کہ ہر تہذیبی عنصر کے اصلی مقصد کو دیکھنا چاہیے قطع نظر اس کے کہ وہ کن جغرافی یا تاریخی اسباب سے وجود میں آیا ہے۔ اس نے اور اس کے پیرووں نے اس طرف توجہ دلائی کہ عموماً بنی نوع انسان اور خصوصاً ابتدائی اقوام کی زندگی میں مختلف تہذیبی عناصر کی حقیقی اہمیت اور ان کے باہمی ربط کا غور سے مطالعہ کرنا ضروری ہے۔

بھیڑوں کا پالنا، گھوڑوں کو پالنے والی قوموں اور گھوڑوں پر سوار ہونے والی جنگجو قوموں کی تہذیب کی درمیانی منزل ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بھیڑوں کا پالنا ایک تو ترکی منگولی زبانیں بولنے والی قوموں میں رائج ہوا، دوسرے ان قوموں میں جو حامی سامی زبانیں بولتی تھیں قبل اس کے کہ وہ وسطِ ایشیا کو چھوڑ کر مشرقی

افریقہ اور عرب میں آباد ہوئیں۔ اس لیے کہ ان دونوں (یعنی وسطِ ایشیا کی ترکی منگولی اور شمالی افریقہ اور عرب کی حامی سامی قوموں کے) علاقوں میں آج تک بدستور بھیڑیں پالی جاتی ہیں۔ ان سے گوشت اون، دودھ اور پنیر وغیرہ حاصل کیا جاتا ہے۔ قالین بننے اور خیموں وغیرہ کے لیے نمدے بنانے کی صنعتوں نے قدرتی طور پر حامی سامی قوموں کے گرم علاقے کی بہ نسبت ترکی منگولی قوموں کے سرد ملک میں زیادہ ترقی کی۔

بکریاں پالنا انسان نے بھیڑیں پالنے کے بعد شروع کیا اس کا تعلق گھوڑے پالنے والی قوموں سے اتنا گہرا نہیں جتنا بھیڑیں پالنے کا۔ وحشی بکری کا گھر ایشیائے کوچک ہے۔ اس لیے ہمیں اس بات پر تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ بکری مویشی کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ زراعتی مادری تہذیب میں بھی پائی جاتی ہے اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں بھی۔ بکری سے کام لینا یا تو دونوں تہذیبوں میں اس وقت شروع ہوا ہوگا جب وہ شہری ریاست کے اعلیٰ تمدنی درجہ پر پہنچ گئی تھیں، یا اس کی ابتدا ان مخلوط تہذیبوں کی زراعتی جدوجہد کے سلسلے میں ہوئی ہوگی جو مادری شہری ریاستوں کے گھڑ چڑھی جنگجو قوموں کے ہاتھ سے فتح ہونے کے بعد وجود میں آئیں۔

سؤر پالنا مادری تہذیب کی تیسری منزل کی ایک خاص شکل ہے اور اس کا ذکر پانچویں باب میں آچکا ہے۔ وہاں ہم نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ مادری تہذیب کے حاملوں نے خانہ بدوش

گلہ بانوں کے اثر سے سوٴر کے گلّے پالنا شروع کیا ہوگا۔لیکن حسب ذیل دلائل سے اس کی تردید ہوتی ہے۔ اوّل یہ کہ سوٴر بھی کتّوں کی طرح قصداً نہیں پالے گئے بلکہ آپ ہی آپ انسانوں خصوصاً مادری تہذیب کے خوش حال زراعت پیشہ لوگوں کے بچے کھچے ٹکڑے کھانے اور ان کے گھروں کے پاس رہنے کے عادی ہو گئے۔ دوسرے (اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ شروع میں وہ قصداً پالے گئے تھے) ان کے پالنے کا محرک اس سے مختلف ہوگا جو خانہ بدوش گلہ بانوں کے لیے گھوڑے وغیرہ پالنے کا محرک تھا، اس لیے کہ سوٴر میں نہ تو جسمانی طاقت ہوتی ہے اور نہ بار برداری کی صلاحیت بلکہ صرف اس کا گوشت کھایا جاتا ہے اور وہ بھی بہت کم۔ تیسرے یورپ اور امریکا کی موجودہ کاشت کاری کو چھوڑ کر کہیں ایسا نہیں ہوا کہ کسی قوم کی ساری معاشی زندگی سوٴروں کے پالنے پر مبنی ہو جس طرح خانہ بدوش گلہ بانوں کی زندگی بعض جانوروں کے پالنے پر مبنی تھی۔ سوٴر کی حیثیت کل ابتدائی تہذیبوں میں محض ثانوی اور غیر اہم تھی، صرف ملانیشی اور پولی نیشی قوموں میں اسے آگے چل کر اہمیت حاصل ہوئی اور وہ اس طرح کہ پہلے ان کے میگالیتھی تہذیبی نظام میں سانڈ کی قربانی ہوتی تھی لیکن جب وہ جنوب مشرقی ایشیا سے ہجرت کرکے بحرِ جنوبی کے جزائر میں پہنچے تو وہاں سانڈ کو اپنے ساتھ نہیں لے جا سکے اور اس کے بجائے سوٴر کی قربانی کرنے لگے۔ نر سوٴر جس کے لمبے دانت مصنوعی طریقے سے خمدار بنائے

جاتے ہیں، بحرِ جنوبی کے جزائر میں نہ صرف قربانی کے کام آتا ہی بلکہ بڑا شریف سمجھا جاتا ہی اور اس کا مالک ہونا عزّت اور شان و شوکت کی نشانی ہی۔ ایسی صورتیں شاذ ہیں کہ سُور کو یہ "قابل عزت" پالتو جانور کا رُتبہ اور اس کی قربانی کو یہ مذہبی اور معاشرتی قدر حاصل ہوئی ہو۔ اس کی ایک اور مثال قدیم ٹیوٹانی قوموں کا "سُور ناچ" اور کرسمس اور ایسٹر کے موقعوں پر سوّر کو ذبح کرنے اور اس کے گوشت کا دلمہ[۱] کھانے کا رواج ہی جو شمالی جرمنی میں اب تک پایا جاتا ہی۔

سوّر کا گوشت کھانے سے حامی سامی گھڑ چڑھی جنگجو قوموں کو جو نفرت تھی اور ان کی متمدن نسلوں کو اب تک ہی اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہی کہ یہ قومیں مشرقِ قریب میں داخل ہوئیں تو وہاں کے مذہبی اور معاشی نظام میں جو ان کی طبیعت کے خلاف تھا سوّر کو خاص اہمیت حاصل تھی۔

عہد متاخر حجری میں شمالی اور مغربی افریقہ اور مغربی یورپ کی زراعتی تہذیبوں اور ڈینیوب کی تہذیب میں سوّر پالنے کا عام رواج تھا۔

جنوبی امریکا میں یورپی اثر سے پہلے لاما کے پالنے کا مسئلہ نہایت دلچسپ ہی۔ یہ "پہاڑوں کا اونٹ" جسامت، شکل اور مزاج کے لحاظ سے اصلی اونٹ اور بھیڑ کے بین بین ہی۔ اینڈیس کے کوہستانی علاقے میں ترقی یافتہ المارا اور کیچوا قومیں اسے سدھا کر اس کے گلّے بنا لیتی تھیں، اس کی اُون استعمال کرتی تھیں اور اس

---

[۱] Sauzage.

سے بار برداری کا کام لیتی تھیں۔ کبھی کبھی اس کا گوشت بھی کھاتی تھیں۔ بڑے بڑے گلے پیشہ ور گلہ بانوں کی نگرانی میں رکھے جاتے تھے، اور کسی کی ذاتی ملک نہیں بلکہ جماعت کی املاک سمجھے جاتے تھے۔ یورپی اثر سے پہلے شمالی اور جنوبی امریکا کے اتنے بڑے وسیع علاقے میں کتے اور نیم اہلی فیل مرغ کے علاوہ صرف لاما ہی ایک پالتو جانور تھا، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جو امریکا کے "اصلی باشندے" کہلاتے ہیں اور اصل میں مشرقی ایشیا سے آبنائے بیرنگ کے راستے آئے تھے اس وقت کے آئے ہوئے ہیں جب مشرقی ایشیا میں جانوروں کے پالنے کا رواج بہت عام نہیں ہونے پایا تھا۔ اب یہ دلچسپ سوال پیدا ہوتا ہے کہ لاما کا پالنا جنوبی امریکا کی ترقی یافتہ تہذیبوں نے خود ہی شروع کیا یا ایشیا کی جہازراں قوموں سے سیکھا۔ عام لوگوں کو پہلی صورت زیادہ قرینِ قیاس معلوم ہوتی ہے۔ ہم علم الاقوام کے موضوع اور طریق تحقیق کے ابواب میں اس بنیادی مسئلے پر بحث کر چکے ہیں کہ آیا دُور دراز ملکوں میں تہذیبی عناصر الگ الگ وجود میں آئے یا ایک جگہ سے شروع ہو کر سب کہیں پھیلے۔ جنوبی امریکا میں لاما پالنے کے رواج کی اچھی طرح چھان بین کی جائے تو اس سے نشرِ تہذیب کی تائید ہوتی ہے۔ اس کے دلائل حسب ذیل ہیں:۔

اوّل یہ کہ ایشیا کے جہازرانوں کا امریکا آنا مسلّم ہے۔ دوسرے یہ کہ میکسیکو میں ازٹیک قوم اور وسطی امریکا میں مایا قوم کی ترقی یافتہ شہری تہذیبیں، سوائے کتّے اور فیل مرغ کے اور کوئی جانور پالنا نہیں

جانتی تھیں۔ تیسرے لاما کے پالنے کا طریقہ صاف ظاہر کرتا ہی کہ خود یہ جانور تو نہیں مگر اونٹ اور بھیڑ کی قسم کے جانوروں کو سدھانے اور ان سے کام لینے کا اصول باہر ہی سے آیا تھا۔ پھر بھی ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ اس خاص صورت میں نشر تہذیب کا عمل وقوع میں آیا۔

بِلّی پالتو جانوروں میں سب سے خوبصورت اور آزاد منش جانور ہی۔ اِس کا پالنا صریحی طور پر قدیم مصر میں شروع ہُوا اور اسے ان شہری تہذیبوں کے آثار میں سے سمجھنا چاہیے جو اصل میں مادری وراثت پر اور معاشی حیثیت سے گیہوں کی کاشت پر مبنی تھیں۔ اس کا فیصلہ کرنا مشکل ہی کہ بِلّی کا پالنا قصداً شروع ہُوا یا بلا قصد۔ بہر حال مصری بِلّی کو ایک مقدّس جانور سمجھتے تھے اور دنیا کے بعض مشاہیر جن میں پیغمبر اسلام کی ذاتِ اقدس بھی شامل ہی اسے محبوب رکھتے تھے۔ یورپ میں پالتو بلّی حقیر سمجھی جاتی تھی غالباً اس لیے کہ ایک بیرونی تہذیب سے تعلق رکھتی تھی جو اس زمانے میں یورپی تہذیب سے برتر تھی لیکن ایشیائے کوچک، ایران، چین اور سیام میں اس کی قدر پالتو جانوروں میں سب سے زیادہ تھی۔ ان ملکوں میں اس کی افزائشِ نسل پر توجہ کی گئی اور کئی خاص قسمیں پیدا کی گئیں۔ یہ ایک دلچسپ بات ہی کہ گو بہت سے لوگ شکاری، پہرہ دینے والے اور پالتو جانوروں سے بڑی محبّت رکھتے ہیں پھر بھی اگر انسان کو "کُتّا" کہہ دیں تو وہ اپنی انتہائی توہین سمجھتا ہی لیکن "بِلّی" کا لفظ زیادہ سے زیادہ چھیڑنے اور بنانے کے لیے آتا ہی۔ گالی میں

داخل نہیں۔

مختلف قسم کی مرغیوں کو پالنے کی تاریخ ایک دلچسپ مسئلہ ہے جو علم الاقوام اور علم حیوانات میں مشترک ہے۔ ہماری معمولی مرغیاں ہندستان کی نسل سے ہیں۔ اس کا پالنا بہت پرانے زمانے میں شروع ہو گیا تھا۔ اگر اس مسئلے کی پوری طرح چھان بین کی جائے، ہندستان، چین، مصر، یونان اور روما کی تحریروں، تصویروں اور ان اشارات سے جو کہانیوں میں ملتے ہیں فائدہ اٹھایا جائے تو بہت کچھ دلچسپ معلومات حاصل ہوگی۔

ہاتھی کے پالنے کا ہم نے یہاں ذکر نہیں کیا اس لیے کہ حقیقت میں یہ عظیم الشان جانور اہلی بنا ہی نہیں ہے۔ پالتو ہاتھیوں کے بچے بالکل نہیں ہوتے یا بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اب رہا اس کا سدھانا تو اب تک پتہ نہیں چلا کہ اس کی ابتدا کیونکر ہوئی۔ خیال ہے کہ ہاتھی جنوبی چین میں پایا جاتا تھا۔ وہ قومیں جو چینیوں سے پہلے یہاں بستی تھیں اور وہ چینی جو پہلے پہل اس علاقے میں آباد ہوئے عام طور پر ہاتھی سے کام لیتے تھے۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہاتھی کا سدھانا سب سے پہلے ہندستان میں شروع ہوا یا کہیں اور۔

خاتمہ

مادری اور ٹوٹمی تہذیبوں کی طرح خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب بھی اسی اولین تہذیبی دائرے سے نکلی ہے۔ ظاہر ہے کہ

اس کی اصل اولین تہذیب کی شمالی شاخ ہوگی۔ جغرافی تقسیم کے علاوہ جو دلچسپی اس تہذیب کے حاملوں کو جانوروں سے ہے اُس سے بھی اس خیال کی تائید ہوتی ہے۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کا سارا مادی معاشرتی اور مذہبی نظام جانوروں کے بڑے بڑے گلّوں کو سدھانے اور پالنے پر مبنی ہے جس کی ابتدا شمالی ایشیا کے وسیع کھُلے میدانوں میں ہوئی۔

اگر خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب جو اولین تہذیب کی ایک شاخ سے نکلی تھی اسی علاقے تک محدود رہتی تو اس میں "عالم گیر تقسیم" کی صفت نہ ہوتی جو ہماری تعریف کی رو سے تہذیبی دائرے کی لازمی صفت ہے۔ لیکن بہت جلد اس ابتدائی تہذیب کی مختلف شاخوں نے قبل اس کے کہ وہ ثانوی منزل تک پہنچتیں، ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے بڑے علاقوں پر حملہ کر کے انھیں فتح کر لیا اور اس طرح اگر ساری دنیا میں نہیں تو کم سے کم کئی اقلیموں میں پھیل گئیں۔

خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کا جغرافی مرکز سیان کی سطح مرتفع تھی جس کے آس پاس پالتو جانوروں کی سب اہم قسمیں رہا کرتی تھیں اور بعض اب تک پائی جاتی ہیں۔

ہماری ساری معلومات اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ سب سے پہلا پالتو جانور چھوٹی قسم کا شمالی ہرن تھا جو ابتدا میں سواری کے کام نہیں آتا تھا بلکہ صرف اس کا گوشت کھایا جاتا تھا۔ آگے چل کر بڑی قسم کے ہرن اور گھوڑے کو پالنے کی بدولت گلہ بان

قومیں جنگجو سواروں کی قومیں بن گئیں۔

اصلی خانہ بدوش گلہ بانوں کی مادری تہذیب سے نوع انسانی کی ترقی میں اس سے زیادہ مدد نہیں ملی کہ اُسے بڑے بڑے جانوروں کا جو گلوں میں رہتے ہیں پالنا اور سدھانا آگیا۔ لیکن یہ بجائے خود بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ ابتداءمیں معاشی حیثیت سے یہ چیز اتنی زیادہ مفید نہ تھی لیکن آگے چل کر جب گھوڑے سواری کے کام آنے لگے تو ایک ایسی جنگی قوت پیدا ہوگئی کہ چھوٹے چھوٹے ٹوٹمی قبائل کا تو کیا ذکر ہے مادری شہری تہذیبوں کی فوجی طاقت بھی اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی تھی۔ فتوحات کے ذریعے سے اپنے اصولوں کو مفتوح قوموں کی معیشت پر عائد کرکے شمالی ایشیا کے خانہ بدوش گلہ بانوں نے بالواسطہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد ڈالی۔

خانہ بدوش گلہ بانوں کے معاشرتی تصوّرات قطعاً حکومتِ پدری کے اصول پر مبنی ہیں۔ ان کے ہاں خاندان پر اُس مرد کی حکومت ہوتی جو عمر میں سب سے زیادہ ہو۔ سب سے بوڑھے مرد کا خاندان کے کل افراد خصوصاً عورتوں کی جان و مال کا مالک بن جانا اور مطلق العنانی سے حکومت کرنا دو باتوں کا نتیجہ ہے۔ ایک تو وہ مرد جو بڑے بڑے گلّوں کا مالک ہوتا تھا معاشی اقتدار رکھتا تھا دوسرے اس کے ہزاروں جانوروں پر حکومت کرنے کا نفسیاتی اثر خاندان کے اور لوگوں پر پڑتا تھا۔ علاوہ اس کے سب سے معمّر مرد مشترکہ خاندان کا مطلق العنان حاکم ہوتا ہے۔ خانہ بدوش گلہ بانوں کے معاشی نظام کی بعض اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں۔ سب سے

بیٹے کو ترکہ پہنچنا، لڑکیوں کو خرید کر یا زبردستی پکڑ کر ان سے شادی کرنا، مہر کی رسم، بکارت کا امتحان، عورت کا باپ یا شوہر یا بیٹے کی مِلک سمجھا جانا۔ غلامی کا طریقہ یا آزاد اور پابند انسانوں کی تفریق ان گلّہ بانوں سے شروع ہوئی جو اپنے گلّوں کے ضائع ہو جانے کی وجہ سے نادار اور محتاج ہو جاتے تھے۔ ایسے بدنصیبوں کی بے غرضانہ مدد کا دستور جو اولین تہذیب میں پایا جاتا تھا "گلّوں کی سرمایہ داری کے دوَر میں ختم ہو گیا۔

اصلی گلّہ بانوں کی تہذیب میں بزرگ خاندان کی مطلق العنان حکومت میں اعتدال پیدا کرنے والی قبیلے کی کم و بیش جمہوری حکومت تھی جس میں خاندان کا ہر سردار برابر کا شریک تھا۔ لیکن اس سے عورتوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا تھا اور ان کی حالت بہت ابتر ہو گئی لڑکیوں یا لڑکوں کی محرمی کی رسمیں اس تہذیب میں موجود نہ تھیں۔

ان لوگوں کے مذہبی تصوّرات میں ایک بلندی اور شان پائی جاتی ہے اس لیے کہ بڑے بڑے وسیع علاقوں پر قبضہ کرنے اور بے شمار جانوروں پر قابو پانے کا اثر ان کے خیالات پر پڑا ہے۔ کائنات پر ایک پُرجلال ہستی کی حکومت ہے جو کبھی کبھی غصّے میں اپنی ساری مخلوق کو فنا کر دیتی ہے۔ خدا کی وحدت کا اگر کچھ تصوّر ان کے ہاں رہ گیا ہے تو یہ اس رحم و کرم نورِ محض، وجودِ مطلق کا تصوّر نہیں جو اولین تہذیب میں تھا بلکہ یہ مطلق العنان حکومت کے عادی گلّہ بان خدا کو ایک جبّار و قہار حاکم سمجھتے ہیں۔ شیطان کا تصوّر اور متعدد ارواح کی پرستش ان کے مذہب کی ایک اور خصوصیت ہے۔ قربانی کا یہ طریقہ بھی قابلِ ذکر ہے کہ گلّے

میں سب سے خوبصورت جانور خدا کے نام پر چھوڑ دیا جاتا تھا یا اس کا
گلا گھونٹ دیا جاتا تھا۔ آگے چل کر اُسے ذبح کرنے کا رواج ہوگیا۔ بزرگوں
خصوصاً قبیلے کے سورماؤں کی پرستش گلّہ بانوں کی تہذیب کی بعض نیم
مذہبی جماعتوں کی خصوصیت ہے۔ نشہ آور مشروبات خصوصاً گھوڑے کے
دودھ کی شراب کا استعمال انھیں کے ہاں شروع ہوا۔

میان کی سطح مرتفع سے ان قوموں کے سائبیریا اور جنوبی رُوس
میں پھیلنے کا اُوپر ذکر ہو چکا ہے۔ ثانوی منزل میں پہنچ کر اس تہذیب اور
اس کے حاملوں نے ایشیا، افریقہ اور یورپ کے بڑے بڑے وسیع
علاقے فتح کر لیے اور بہت کچھ تغیّر تبدل کے بعد ان لوگوں نے
جہاز رانوں کی حیثیت سے جدید مشینی تمدن کو لے کر ساری دُنیا میں
نوآبادیاں اور سامراج قائم کیے۔

خانہ بدوش گلّہ بانوں کی تہذیب کی ابتدائی نشوونما میں تین لسانی
جماعتیں شریک تھیں، ترکی منگولی، انڈو یورپی اور حامی سامی۔ ان
میں سے ترکی منگولی سب سے پہلی گھڑ چڑھی قومیں تھیں جنھوں نے
خانہ بدوش گلّہ بانوں کا مخصوص تہذیبی دائرہ بنایا۔ اور انھیں نے
اس تہذیب کو خالص شکل میں سب سے زیادہ عرصے تک قائم رکھا
کم سے کم اپنی ان مختلف شاخوں میں جو اپنے اصلی وطن شمالی ایشیا
کے وسیع میدانوں میں باقی رہیں۔ لیکن بقیہ دونوں جماعتوں یعنی
انڈو یورپی اور حامی سامی قوموں کے متعلق یہ بات نہیں کہی جا سکتی
حالانکہ ابتدا میں ان کی تہذیب بھی وہی تھی جو ترکی منگولی گلّہ بانوں
کی۔ اور کچھ عجب نہیں کہ ان کی نسل بھی ان سے ملتی ہو۔ یہ دونوں



مادری تہذیب اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کے گذشتہ اور موجودہ مرکزوں کا نقشہ:

مادری تہذیب کے مرکز:

خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کے مرکز اوران کی ہجرت کے راستے:

(ی) یورال التائی فریق:

(ہ) ہندی یورپی فریق:

(س) سامی حامی فریق:

جماعتیں اپنے وطن یعنی شمالی افریقہ کے میدانوں سے ہجرت کر گئیں۔ اور اپنی فتوحات کے سلسلے میں انھوں نے بھی اسی حد تک (بلکہ اس سے بھی زیادہ) مفتوح قوموں کی تہذیب کو اختیار کر لیا جس حد تک منگولی قوموں نے چین میں کیا تھا۔ انھوں نے نہ صرف مفتوح مادری شہروں، ریاستوں کی مادّی تہذیب کو بلکہ ان کے معاشرتی اور مذہبی تصوّرات کو بھی لے لیا۔ اسی لیے بعد کی مخلوط تہذیبوں میں اس قدر کثرت سے قدیم روایات اور مادری تہذیب کے تصوّرات اور اصول پائے جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ان تین بڑی لسانی جماعتوں میں جو پہلے ایک ہی تہذیبی دائرے سے تعلق رکھتی تھیں اب جُدا جُدا تہذیبیں پائی جاتی ہیں۔ یہ تفریق اس سے اور بڑھ گئی کہ ان سب کے ہاں فاتح اور مفتوح میں آپس میں شادی بیاہ کرنے کا دستور تھا۔ اس دستور سے یہ بڑا فائدہ تھا کہ جو قومیں پہلے ایک دوسرے کی دشمن تھیں ان میں میل جول ہو جاتا تھا اور ایک نئی مخلوط نسل پیدا ہوتی تھی جو عموماً دونوں قوموں کی بہترین صفات رکھتی تھی۔ اس کے علاوہ اسی "اجتماع ضدین" کی بدولت پدری تہذیب نے مادری تہذیب سے علم، تہذیب اور ہم آہنگی حاصل کی اور مادری تہذیب نے اس سے نئے خیالات اور محرکات لیے۔

قرآن مجید میں آیا ہی کہ کونین میں ہر چیز "ذکر اور اُنثےٰ" سے پیدا کی گئی ہی۔ علم الاقوام میں گلہ بانوں کی مخصوص رجالی تہذیب اور زراعت پیشہ قوموں کی نسوانی تہذیب اور سب سے پہلی شہری ریاستوں کے اختلاط کی جو شہادت ملتی ہی وہ اس ابدی حقیقت

کو ظاہر کرتی ہے۔ جس نے مغرب کے اکثر سائنس دانوں کو حیرت میں ڈال دیا ہے۔

اس موضوع پر ناروے، سویڈن اور روس کے ماہرینِ علم الاقوام نے بہت کچھ لکھا ہے۔ ف۔ راتسل اور آگے چل کر و۔اشمٹ اور ای۔ہان نے اس مخصوص تہذیب کے وجود پر زور دیا۔ دوسرے مستند مصنّفین یہ ہیں :۔ لیہٹی سالو، کائی ڈونر، راثوسن، انٹونیس، لینگ کاویل، آمشلر، ایڈامیٹس، ہیلتس ہائمر، نیہرنگ، ٹرمبورن، اسٹیر برگ اور متعدّد روسی مصنّفین۔

آٹھواں باب

نوع انسانی کی ترقی کا مفہوم اور اس کی تاریخ

اولین تہذیب اور وہ تین ابتدائی تہذیبی دائرے جو اس سے نکلے اُن کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ان کی نشوونما کے دوران میں نوع انسانی کو بعض چیزوں کے لحاظ سے ترقی کے بجائے تنزل ہوا۔ مذہب میں توحید کے تصور نے مسخ ہو کر توہم پرستی اور کثرت پرستی کی مختلف شکلیں اختیار کرلیں۔ معصومیت ہوا و ہوس اور بہیمیت سے آلودہ ہوگئی۔ وہ جرائم جن کا اولین تہذیب کے عامل نام تک نہیں جانتے تھے مثلاً قتل، چوری، اپنے ہمسایوں کو قصداً نقصان پہنچانا، مادّی فوائد کے لیے جان بوجھ کر جھوٹ بولنا، یہ سب اُن تینوں ابتدائی تہذیبی دائروں کی "ایجادیں" ہیں جو اولین تہذیب کے نشوونما کی "برتر" شکلیں سمجھی جاتی ہیں۔ ہم نے "برتر" کے لفظ کو واوین میں اس لیے رکھا ہے کہ ہم ایسی "برتری" کے قائل نہیں جو اپنے دامن میں ان سب عیوب اور جرائم کو لیے ہوئے ہو۔

شاید کوئی یہ سوال کرے کہ آخر بعد کی تہذیبوں کو "برتر" کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟ کیوں نہ انھیں تہذیب کی بگڑی ہوئی شکلیں کہا جائے۔

اس اہم سوال کا جواب دو لفظوں میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ کسی قدر تشریح کا محتاج ہے۔

ان بعد کی تہذیبوں کے مادّی تمدّن میں یقیناً ترقی نظر آتی ہے اور ایک حد تک معاشرتی تنظیم میں بھی اس لحاظ سے کہ ایک خاندان کے بجائے بڑی بڑی جماعتوں پر حکومت کرنے کا طریقہ دریافت کیا گیا۔ لیکن اس معاشرتی تنظیم میں طریقِ حکومت کی ترقی کے ساتھ ساتھ ظلم اور بے انصافی بھی پائی جاتی ہے جس کا اولین تہذیب میں نام تک نہ تھا۔ فرد کی انسانی عظمت خاک میں مل گئی۔ غریب اور امیر، قوی اور ضعیف، مرد اور عورت کے ساتھ یکساں سلوک باقی نہیں رہا۔

غرض ترقی تو ضرور نظر آتی ہے لیکن جب کبھی ترقی ہوئی اس کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی اور کبھی کبھی یہ سودا بہت مہنگا ثابت ہوا۔ یہ قنوطیت کچھ بے جا نہیں۔ ذرا اولین تہذیب کے حاملوں کی معصوم اور پُرمسرت زندگی، ان کی انصاف پسندی، مساوات، اخوت، سمجھ بوجھ، نیک نیتی، ان کے عقیدۂ توحید کی وضاحت، ان کے فطری حُسن اور ہم آہنگی، ان کی صحت اور صفائی پر نظر ڈالیے اور پھر اس کا مقابلہ "ترقی یافتہ تمدّن" کے اوسط انسان کی بدنصیبی، خود غرضی، خود بینی اور توہم پرستی سے کیجیے تو قنوطیت کے سوا چارہ ہی کیا ہے؟

دوسری طرف عِلم و ہُنر، تنظیم، فنّی قابلیت، دست کاری اور صنّاعی میں مادّی اشیا، حیوانات اور فطرت کی قوتوں پر حکومت کرنے میں ترقی کا ہونا ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ اس قسم کی

ترقی کا رُجحان انسانی زندگی میں ایک قوت ہے جو کسی کے روکے نہیں رُک سکتی۔ خواہ ہم اسے فریب کہیں، خواہ اس سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہو، خواہ اس کی وجہ سے جُرم، بدی اور تکلیف میں اضافہ ہو بہرحال یہ ایک ناگزیر ہے۔ جب کبھی کوئی نئی علمی ایجاد ہوئی ہے یا تنظیم کی کوئی بہتر صورت دریافت ہوئی ہے اس کا مٹانا نہایت دشوار ثابت ہوا چاہے اس میں کتنا ہی نقصان ہو۔

اگر ترقی، نیکی اور راحت میں اضافہ ہونے کا نام نہیں تو پھر آخر کس چیز کا نام ہے؟

اگر ہم افراط و تفریط سے بچ کر انصاف سے کام لیں اور واقعات سے چشم پوشی نہ کریں تو یہ ماننا پڑے گا کہ ترقی میں یقیناً یہ دونوں عناصر بالقوۃ موجود ہوتے ہیں یعنی ہر مادّی اور تنظیمی ترقی میں یہ صلاحیت ہے کہ اگر انسان اس کا صحیح استعمال کرے تو اس کی نیکی اور راحت میں اضافہ ہو۔ مگر وہ اس کے صحیح استعمال سے قاصر رہتا ہے۔

غرض صحیح نظریہ یہ ہے کہ مادّی تمدّن، معاشرتی تنظیم اور علمی تحقیق کے ہر نئے قدم میں "حقیقی ترقی" کا امکان موجود ہے، مگر اکثر اس امکان سے فائدہ نہیں اٹھایا جاتا۔ "برتر تمدن" کی تعریف خاکسار مصنّف کے والد نے یہ کی ہے۔ اور اسے لوگ عام طور پر تسلیم کرتے ہیں کہ وہ نفسیات کی اصطلاح میں ایک برتر "کیفیت صورت" کا نام ہے۔[۱۱] یعنی ایک ایسا مرکب جس کے عناصر میں زیادہ تخصیص پائی جاتی ہے اور ان کی تعداد بھی عموماً زیادہ ہوتی ہے۔ نئی صورت میں اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اُس میں حقیقی وحدت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ ایک نئی چیز ہے جو محض منفرد

عناصر کے مجموعے کے برابر نہیں بلکہ اس سے برتر ہے۔ مثلاً ایک نغمہ محض اُن سُروں کا مجموعہ نہیں جن سے وہ بنا ہے یا ایک عمارت محض اس مسالے کا مجموعہ نہیں جس سے وہ تعمیر ہوئی ہے۔ "صورتیں" دو طرح کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو محض اپنے اجزائے ترکیبی کے مجموعے کے برابر ہے، مثلاً گیلی مٹی یا پتھروں کا ڈھیر۔ دوسری وہ جس کی وحدت اور برتر کیفیت کی بدولت اُس کے اجزا کا مجموعہ ایک نئی اور برتر چیز بن جاتا ہے۔ یہ دوسری صورت پہلی صورت کے مقابلے میں زیادہ آسانی سے خراب ہو سکتی ہے۔ ایک صحیح سالم پرندے مثلاً ابابیل کو لے لیجیے۔ اس کے منفرد اعضا اور مادّے کے ان اجزا کو جن پر اس کا جسم مشتمل ہے غلط طریقے سے ترتیب دینے سے کبھی ایسی خوشنما "کیفیت صورت" وجود میں نہیں آسکتی جیسی ایک جیتے جاگتے پرندے یعنی ابابیل کی ہوتی ہے حالانکہ گیلی مٹی یا پتھروں کے ڈھیر کو چاہے جس طرح ترتیب دیجیے وہی چیز رہے گا جو پہلے تھا۔ یا ایک زندہ پرندے کے جسم سے مادّے کا ایک تھوڑا سا حصہ نکال لیجیے تو وہ مرجائے گا اور وہ نہیں رہے گا جو پہلے تھا۔ لیکن پتھروں کے ڈھیر کا بہت سا حصہ الگ کر لیجیے پھر بھی اس کی کیفیت نہیں بدلے گی۔ اس کا حجم اور وزن کم ہو جائے گا لیکن وہ بدستور پتھروں کا ڈھیر ہی رہے گا۔

غرض ہم یہ کہ سکتے ہیں کہ ایک مرکّب کے اجزا کی تخصیص اور تفریق سے اس کی "کیفیت صورت" برتر ہو جاتی ہے اور اسی کا نام "ترقی" ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ترقی محض فریبِ نظر یا

خدع نفس نہیں ہے۔ ایک حقیقی چیز ہے۔ البتہ ترقی سے فائدہ اٹھانا بہت مشکل ہے اور اکثر اس سے تعمیر کی جگہ تخریب کا کام لیا جاتا ہے۔

چنانچہ نوع انسانی کی ترقی کی یہ تعریف کی جا سکتی ہے کہ وہ تہذیب و تمدن کی کیفیت صورت کی برتری ہے جو علم و ہنر اور تنظیم کے بڑھنے سے حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ناگزیر طور پر غلط استعمال اور تخریب کا خطرہ بھی بڑھ جاتا ہے۔ ترقی انسان پر ذمہ داری کا نیا بوجھ ڈال دیتی ہے اور اکثر وہ اس بوجھ کو اٹھانے کے ناقابل ثابت ہوتا ہے۔ اس طرح ہمیں ترقی کا وہ تصور ہاتھ آگیا جس کے مطابق وہ ایک حقیقی چیز ہے لیکن یہ حقیقت بھی مسلّم ہے کہ دنیا میں ترقی کا صحیح استعمال کم اور غلط استعمال زیادہ ہوتا ہے خصوصاً انفرادی اور اجتماعی اخلاق صحیح مذہبیت کے نقطۂ نظر سے۔

نوع انسانی کی ترقی کی تاریخ کا نظر انصاف سے مطالعہ کرنے کے لیے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم ترقی کا ایک واضح تصوّر رکھتے ہوں۔ اس سے ہمیں نہ صرف اس بات کے اندازے میں آسانی ہوگی کہ ہماری روایات کیونکر وجود میں آئیں بلکہ اس کے سمجھنے میں بھی مدد ملے گی کہ آج کل نوع انسانی کس لیے ایسے خوفناک جرائم کی مرتکب ہو رہی ہے اور آنکھ بند کر کے ہلاکت کی راہ پر چلی جا رہی ہے۔

اگر خوشنما صنعت کے طیارے اس لیے استعمال کیے جا رہے ہیں کہ وہ بے گناہ دیہاتیوں پر آگ اور زہر برسائیں تو اس کا الزام طیّارے کے ایجاد کرنے والے اور بنانے والے پر نہیں

بلکہ اس جارحانہ قوت پر ہے جو ان طیاروں سے تخریب اور ہلاکت کا کام لیتی ہے۔ یا اگر ایک اعلےٰ درجے کی معاشرتی تنظیم کی طاقت اس میں صرف کی جاتی ہے کہ مردوں اور عورتوں کو آزادیٔ ضمیر سے محروم کرکے انسان کی لافانی روح کو ذلیل کیا جائے اور لوگوں کے ہاتھ سے جبراً ان کے بھائیوں پر طرح طرح کے ظلم کرائے جائیں تو یہ معاشرتی تنظیم کے اصول کا قصور ہے یا ان افراد کا جو آزادیٔ ضمیر کا بار نہیں اٹھا سکتے؟ کیا آزادیٔ ضمیر کو بھی اس وجہ سے بُرا کہا جائے گا کہ اس کی ذمہ داری کا اٹھانا مشکل ہے؟ اگر آج ہم تقریباً ہر "اعلےٰ تہذیب" میں انتشار اور تباہی کے آثار پاتے ہیں تو ہمیں یہ کبھی نہیں بھولنا چاہیے کہ یہ ترقی کا ناگزیر نتیجہ نہیں بلکہ اس کی غلط تعبیر اور غلط استعمال کا نتیجہ ہے جس کے ذمہ دار قوموں کے رہنما ہیں۔ ان میں شاید ہی کوئی ایسا نکلے جو نئی ایجادوں کے بلند تر مقصد کو سمجھتا ہو اور اس ذمہ داری کو محسوس کرتا ہو جو تہذیب و ترقی کے نئے وسائل انسان پر عائد کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ انسانی ترقی کی تاریخ کیا ہے، وہ کون سی قوتیں ہیں جو ترقی کی محرک ہوتی ہیں؟ وہ کون سے "قوانین قدرت" ہیں جن کے تحت میں نئی ایجادیں اور تہذیب کی نئی صورتیں وجود میں آتی ہیں؟ یہاں ہم پچھلے چار بابوں سے سبق حاصل کر سکتے ہیں جن میں اولین تہذیب اور ان میں ابتدائی تہذیبوں کا جو اس سے نکلی تھیں یعنی مادری، ٹوٹمی اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب کا ذکر ہے۔ ان میں ہم نے انسانی معاشرت کی نشو و نما اور

ترقی کے تین مختلف رجحانات کا مطالعہ کیا تھا (الف) زراعتی مادری تمدّن جس کی حامل متعدد امن پسند حضری قومیں تھیں (ب) شکاری قوموں کا معتدل پدری تمدن جیسے صنعت، تقسیم محنت اور (مصنوعی) تنظیم سے خاص مناسبت تھی۔ (ج) خانہ بدوش گلہ بانوں کا خاص پدری تمدّن جس نے بڑے بڑے جانوروں کو قابو میں لانے اور ایک زبردست فوجی قوت پیدا کرنے میں کامیابی حاصل کی اور دوسری قوموں کے وسیع علاقے فتح کر لیے۔

اسی کے ساتھ ہم نے وہ بنیادی قوتیں بھی معلوم کر لی تھیں جن سے یہ ایجادیں اور تہذیبی صورتیں وجود میں آئیں۔ یہ قوتیں کچھ تو مادّی تھیں اور کچھ ذہنی۔ اس پر جتنا زور دیا جائے کم ہی کہ مادی اور ذہنی قوتیں ہمیشہ مل کر کام کرتی ہیں۔ انسان کو یک طرفہ نظام بنانے کا اس قدر شوق ہی کہ وہ ہر چیز کی توجیہہ یا تو خالص مادّی محرکات سے کرتا ہی یا خالص ذہنی محرکات سے۔ لیکن حقیقت کسی یک طرفہ نظام کی پابند نہیں بلکہ اس میں یہ دونوں پہلو موجود ہوتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ مادری تہذیب کا محرک ایک معاشی اصول تھا یعنی زراعت کی ایجاد جس کا سہرا عورتوں کے سر ہی جو پہلے خودرو پودوں کی پرداخت کرتی تھیں اور پھر ان کی کاشت کرنے لگیں۔ لیکن مادری تہذیبی دائرے کا بنیادی نظام جس کے تحت میں ان قوموں کے مذہبی عقائد اور معاشرتی قوانین نے نشو و نما پائی ایک خالص ذہنی محرک کی بدولت وجود میں آیا۔ کھیتی اور کھیتوں کے قریب مستقل مکان بنانے کی توجیہہ تو مادی مصلحتوں سے کی

جا سکتی ہے جو عورتوں کی طبیعت سے مناسبت رکھتی تھی۔ شادی کا وہ طریقہ بھی جس کے مطابق دولھا دلھن کے گھر جا کر رہتا ہے ان مادّی حالات کا نتیجہ کہا جا سکتا ہے۔ لیکن کیا ان حالات سے چاند کی دیومالا، خون کی طلسمی تاثیر کا عقیدہ، لڑکیوں کی ماہواری کی اہمیت اور نجات دہندہ کا تصوّر کوئی لازمی تعلق رکھتا ہے؟ ہرگز نہیں۔ کیا ان سے ایک عورت کے کئی مردوں سے شادی کرنے کا رواج، ماموں کی قدر و منزلت، مردوں کی خفیہ انجمنیں، کھیتوں کو زرخیز بنانے کی رسمیں، انسانوں یا ان کی بجائے جانوروں کی قربانی لازمی طور پر وابستہ ہے؟ ہرگز نہیں۔ لیکن حقیقت میں یہی وہ اجزائے ترکیبی ہیں جنھوں نے مادّی عناصر کے ایک غیر معین مجموعے کو ایک "کیفیت صورت" ایک زندہ تہذیب بنا دیا۔

انسانی ترقی کے اس عمل کی یہ واحد مثال نہیں۔ یہی چیز ہمیں ٹوٹمی تہذیب اور خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں نظر آتی ہے جن کا نظام پدری وراثت پر مبنی ہے۔ ٹوٹمی قوموں میں شکاری اور خانہ بدوش قوموں میں گلّوں کے پالنے والے مردوں کے معاشی اقتدار سے ایک جداگانہ نظام کی مادّی بنیاد قائم ہوئی۔ لیکن اس نئی صورت کے وجود میں آنے کے بعد اس کی مزید تشکیل ذہنی قوتوں نے کی جو ہرگز اُس کی مادّی بنیاد سے وابستہ یا مادّی حالات کا نتیجہ نہیں تھیں۔

نہ ٹوٹمی تہذیب اس پر مجبور تھی کہ جانوروں سے فرضی رشتے قائم کرکے اپنی جماعتوں کی مصنوعی تنظیم کرے اور نہ دوشیزگی کا امتحان

یا شیطانی قوت کا عقیدہ جانوروں کے گلّے پالنے کا لازمی نتیجہ تھا۔

اسی موقع پر ظاہر ہوتا ہے کہ ہم نے علم الاقوام کی تحقیقات کو تاریخی طریقہ کہا تو کچھ بے جا نہیں کہا۔ بڑی بڑی تہذیبوں کی تشکیل حقیقت میں افراد کی ذاتی تحریک سے ہوتی ہے۔ جو افراد علم الاقوام میں اہمیت رکھتے ہیں ان کا پتہ ہم تحریری مواد سے پرانے مسودات اور بیاضوں سے یا ایک ہی موضوع کے متعلق مختلف بیانات کا مقابلہ کرنے سے نہیں چلا سکتے۔ یہ تو انھیں قوموں کے بارے میں ہو سکتا ہے جن کے ہاں تحریری روایات موجود ہیں۔ پھر بھی جیسا ہم دیکھ چکے ہیں علم الاقوام کے مشاہدات کا مقابلہ کرنے سے اور بالواسطہ نتائج اخذ کرنے سے بہت کچھ کام چل جاتا ہے۔

افراد کی اہمیت کسی تاریخی بحث کی محتاج نہیں۔ ایک فرد بشر علم اور ترقی کی راہ میں بہت کچھ کر سکتا ہے۔ لیکن چونکہ ہر انسان کی رائے میں خطا کا امکان ہے اس لیے ہمیں تعجب نہیں ہونا چاہیے کہ تقریباً کُل اعلیٰ تہذیبوں میں اس قدر غلط خیالات اور اصول رائج ہو گئے ہیں۔ تہذیب کی اولین بنیاد نہایت واضح، سادہ اور بلند تھی۔ وہ معاشی حالات جو بعد کی تہذیبوں میں پیدا ہوئے بہت مناسب تھے اور ان کا عمل بھی ابتدا میں عقل کے مطابق تھا۔ لیکن جب افراد اور ان کے ساتھ جماعتوں نے روایات، رسوم، توہمات، واقعات کی تعبیروں اور تخیلات کی ایک عمارت کھڑی کر دی تو غلطیوں کا ہونا لازمی تھا۔ یہ ایک قدرتی اور ناگزیر چیز تھی۔ لیکن تعجب ہے کہ یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے۔ مغرب کے وہ حضرات بھی جو ہر چیز کی تعبیر مادّی نقطۂ نظر سے کرتے ہیں اور مشرق و مغرب کے وہ بزرگ بھی جو مذہب اور

روایات کو اہمیت دیتے ہیں۔ انسان کی معاشرتی اور مذہبی زندگی کی نشوونما کی توجیہہ میں ایک ہی قسم کی غلطی کرتے ہیں۔

اوّل الذکر یہ سمجھتے ہیں کہ جتنی رسوم پیدا ہوئیں ان کی کوئی نہ کوئی عملی اور معاشی وجہ ضرور تھی حالانکہ اکثر صورتوں میں اس کے سوا کوئی وجہ نہیں ہوتی کہ انسان نے غلطی کی اور اپنی سینہ زوری سے اس پر قائم رہا۔ ٹوٹمی تہذیبی دائرے میں مردوں کے مخروطی یا استوانی شکل کی چوٹیاں باندھنے میں نہ کوئی "گہری حکمت" پوشیدہ ہے اور نہ کوئی "عملی مقصد"۔ یہ صرف کاہلی اور خود نمائی اور افتخار کے جذبات ہیں۔ جنھوں نے اپنے اظہار کی ایک خاص راہ نکالی ہے۔ مغربی محققوں نے اکثر یہ دھوکا کھایا کہ ان رسوم و روایات کی معاشی اور عملی وجوہ تلاش کرنے لگے جو محض ان افراد کے شخصی ذوق پر مبنی ہیں جن میں قوت ضرور تھی مگر اس کے ساتھ دانشمندی اور نیک نیتی کا ہونا ضروری نہ تھا۔

بہ خلاف اس کے مشرق اور دنیا کے دوسرے حصوں کے مذہبی لوگ اکثر ابتدائی قوموں کے خیالات اور رسوم و روایات کی تعبیر ان تصوّرات کے مطابق کرتے ہیں جو انھوں نے پہلے سے قائم کر رکھے ہیں۔ چنانچہ وہ بہت سے موقعوں پر تعریف یا مذمت سے کام لیتے ہیں، جہاں نہ تعریف کا محل ہے اور نہ مذمت کا۔ مثلاً اگر خانہ بدوش گلہ بانوں کے توہمات عیسائی مبلغوں کے ہم وطن کسانوں کے توہمات سے مطابقت رکھتے ہیں اس لیے کہ دونوں کی اصل علم الاقوام کے لحاظ سے ایک ہی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ ان کا امتحانِ بکارت کا اصوُل یا ارواحِ خبیثہ کا تصوّر لازمی طور پر صحیح ہے۔

تاہم یہ انسان کی فطرت ہو کہ جب ایک ہی قسم کے تصوّرات دنیا کے مختلف حصوں میں پائے جاتے ہیں تو وہ اسے ان کے صحیح ہونے کی دلیل سمجھتا ہو۔ روایات عقل اور منطق کی پابند نہیں ہوتیں۔ رسم و رواج اور معاشرتی تصوّرات کا کوئی "قدرتی قانون" نہیں ہو۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ تینوں بنیادی تہذیبی دائروں میں سے ایک بھی کسی خاص خطّے، زبان، مذہب قوم یا نسل تک محدود نہیں رہا۔ خواہ ان تہذیبوں کے منفرد تصوّرات میں کتنا ہی اختلاف بلکہ تضاد ہو وہ ہمسایہ قوموں میں ایک دوسرے کے دوش بدوش پائی جاتی ہیں۔ ہندستان میں ایک ہی ذات کے لوگ ملا بار میں مادری طرز کی اور تامل اور تلنگی زبان کے علاقوں میں ٹوٹمی طرز کی معاشرتی تنظیم کے تحت میں پائے جاتے ہیں اور جہاں کہیں آریا مذہب کے اثرات نے ان کے خیالات کو بدل دیا ہو وہاں خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب سے قریب تر ہیں۔ اور ایک ہندستان ہی میں نہیں ساری دنیا میں یہی حال ہو۔ اس لیے روایات نہ صرف عقل اور منطق سے بلکہ ان جماعتوں کی قومی، نسلی، جغرافی، لسانی خصوصیات سے بھی کوئی تعلق نہیں رکھتیں جنھوں نے ان کو قائم کیا ہو یا اختیار کر لیا ہو۔ مذہبی، معاشی اور معاشرتی روایات غرض تہذیبی دائرے کا سارا انظام اسی حد تک قوی اور با اقتدار افراد کے آزاد ارادے پر منحصر تھا جس حد تک آج کل سیاسی تصوّرات ہیں۔ یہ سوال بے شک اتنی ہی اہمیت رکھتا ہو کہ ایک خاص تہذیب کہاں اور کن حالات میں وجود میں آئی جتنی یہ سوال کہ ایک خاص سیاسی تصوّر کہاں اور کن حالات میں پیدا ہوا۔ لیکن جب کوئی تصوّر

ایک بار وجود میں آگیا تو اس کا پھلنا کچھ موافق اور ناموافق حالات پر منحصر نہیں۔ دراصل نہ تو کسی نسل میں مادری یا ٹوٹمی یا خانہ بدوش گلّہ بانوں کی تہذیب سے کوئی طبعی مناسبت ہوتی ہے اور نہ جمہوری یا شخصی، عمومی یا استبدادی طرز حکومت کی طرف "خلقی" یا "فطری" رُجحان ہوتا ہے۔ ہاں جب ایک خاص قسم کی روایات قائم ہوجائیں تو پھر جو قدم بھی اٹھتا ہے وہ ایک خاص معاشی یا معاشرتی یا مذہبی نظام کے تحت میں اٹھتا ہے۔

ہم کسی قوم کی پوری تہذیب اور روایات کو اس طرح اچھا یا بُرا نہیں کہہ سکتے جس طرح افراد کو کہتے ہیں۔ انسانی تہذیب کا کوئی عام معیار نہیں جس پر ہر تہذیب جانچی جا سکے۔ یہ مانا کہ اولین تہذیب میں بہت بڑی خوبی اور ہم آہنگی اور اخلاقی بلندی پائی جاتی تھی۔ اس سے انحراف کرنا ہمارے نزدیک قابلِ افسوس تھا۔ انحراف کرنے والوں کے بگڑے ہوئے اخلاقی تصوّرات کو ہم اپنے لیے ناقابل قبول قرار دے سکتے ہیں۔ مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ نوعِ انسانی طرح طرح کے تجربے کرنے، بھٹکنے اور ٹھوکریں کھانے کے بغیر اولین تہذیب کی سادگی اور بلندی کو الہامی مذاہب کی شکل میں دوبارہ حاصل نہیں کرسکتی تھی۔ اسلامی عقیدے کے مطابق دنیا کے سب سے پہلے یعنی حضرت آدم خدا کے بھیجے ہوئے پیمبر تھے۔ یہ عقیدہ اس تصور سے مطابقت رکھتا ہے جو علم الاقوام میں مذہب اور اخلاق کے آغاز کے متعلق ہے۔ انسان کا زندگی کی غایت اور اس کے فرائض کا ابتدائی تصور بہت سادہ مادّی حیثیت سے محدود، مگر روحانی حیثیت سے

نہایت بلند تھا۔ اسلام اور بدھ مت دونوں کے نزدیک ایک ہی پیامِ حق تھا جو بہت سے پیمبروں نے بار بار مختلف زبانوں میں مختلف قوموں کو پہنچایا۔ یہ بھی علم الاقوام کی تحقیقات کے مطابق ہے جو ہمیں یہ بتاتی ہے کہ انسانی تہذیبیں تمام انحرافات کے باوجود اسی پُرانی سادگی اور وضاحت خیال کو حاصل کرنے کی کوشش کرتی رہیں اور ان کا نتیجہ بڑے بڑے الہامی مذاہب کی شکل میں ظاہر ہوا۔ اسی طرح نوعِ انسانی کی وحدت کے عقیدے کا جو بڑے مذہبوں میں مشترک ہے، نہ صرف انسانی نسلوں کی یکساں جسمانی ساخت سے ثبوت ملتا ہے بلکہ اس سے بھی کہ وہی ایک اولین تہذیب اور اس کی تین ابتدائی شاخیں تھیں جو دنیا بھر میں پھیلیں۔

یہ ان اہم نظری نتائج میں سے چند نتیجے ہیں جو ہم علم الاقوام کی تحقیقات سے اخذ کر سکتے ہیں۔

لیکن اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر ہم خود اپنی روایات اور اوہام کے متعلق بہت کچھ مفید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔

جو صورت اولین تہذیب کے بلند اصولوں کو پیش آئی بالکل وہی صورت الہامی مذاہب کے برتر تصورات کو بھی پیش آئی۔ ان کے واضح اصولوں کو غلط تاویلوں سے مسخ کر دیا گیا اور ان کے ساتھ بہت سے اوہام و روایات اور شخصی خیالات شامل ہو گئے۔ اشخاص، طبقوں اور قوموں کے رجحانات، ان کے فیشن، ان کی خود نمائی اور تن آسانی کے سامان مذہب کے سادہ اور شاندار نظام کا جز بن گئے اور ان کی سند کسی نہ کسی طرح انھیں مقدّس کتابوں میں تلاش کر لی گئی جن کے احکام کی کھلم کھلا نافرمانی کی جاتی ہے۔ یہ علم الاقوام کے مطالعے کا ایک

اور فائدہ ہی کہ اس سے تاریخِ تمدّن کی صحیح تنقید میں مدد ملتی ہی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ "ابتدائی قومیں" کسی طرح صحیح راستے سے ہٹ کر گمراہی میں مبتلا ہوئیں، کس طرح انھوں نے بلند اور سادہ تصوّرات کو چھوڑ کر اپنے من مانے اصول گھڑ لیے اور انھیں مذہب کی گدّی پر بٹھا دیا۔ علم الاقوام سے ہمیں یہ سبق بھی ملتا ہی کہ دوسری قوموں کی لغزشوں سے چشم پوشی کریں اس لیے کہ یہ لغزشیں سبھی انسانوں سے ہوتی ہیں۔ مگر اسی کے ساتھ وہ ہمیں یہ سکھاتا ہی کہ اپنے عیوب کا صاف صاف اقرار کریں اور اپنے آپ کو دھوکا نہ دیں اس لیے کہ وہ ہم پر روشن کر دیتا ہی کہ جو معیار ہم نے قائم کر رکھے ہیں وہ در اصل کیا تھے اور اب کیا ہو گئے ہیں۔ دنیا میں کوئی قوم یا نسل اور کوئی مذہب ایسا نہ ہوگا جسے ان تلخ حقیقتوں کا مزہ نہ چکھنا پڑا ہو۔ ہم نے جو چند مثالیں یہاں دی ہیں ان سے کسی کے جذبات کو صدمہ پہنچانا مقصود نہیں۔ ان کی غرض صرف یہ ہی کہ پڑھنے والے علم الاقوام کے نتائج کا خود اپنی رسوم و روایات اور اوہام سے مقابلہ کر کے سبق حاصل کریں۔

مادری تہذیب کے حاملوں کے اوہام، فال اور شگون کے عقیدے کو مدِ نظر رکھ کر ذرا اس پر غور کیجیے کہ ہم جو تین مرتبہ ایک چیز کو دیکھنا مبارک سمجھتے ہیں، بلی کا راستہ کاٹ جانا یا صبح شام مکڑی کا دیکھنا یا لکڑی کو چھونا منحوس سمجھتے ہیں یا بیکار چیزوں کو محض شگون کے لیے اپنے پاس رکھتے ہیں یہ آخر کیا چیز ہی؟ ایک بار مغرب کے ایک کالج میں ایک پروفیسر نے اپنی جماعت کے طلبا سے جو سائنس کی مروجہ تعلیم پائے ہوئے مغربی نوجوان تھے کہا کہ دیانت داری کے ساتھ یہ لکھ دیں

کہ کیا ان کے پاس کوئی ایسی چیز ہی جس کا کوئی مصرف نہیں بلکہ جسے وہ صرف اس لیے اپنے پاس رکھتے ہیں کہ انھیں پسند ہی یا وہ اسے مبارک سمجھتے ہیں۔ ۵، فی صدی نے اپنے جواب میں صاف لکھ دیا کہ ایسی چیزیں برکت کے لیے رکھتے ہیں، ۱۰ فی صدی نے کہا کہ وہ بغیر کسی خاص مقصد کے رکھتے ہیں اور صرف ۱۵ فی صدی نے یہ جواب دیا کہ ان کے پاس ایسی کوئی چیز نہیں۔ یہ دیکھ کر کہ یہ عقیدہ اس قدر عام ہی اور انسان کے دل میں اتنی مضبوطی سے بیٹھا ہوا ہی یہ خیال ہو سکتا ہی کہ اس کی کچھ نہ کچھ اصلیت ضرور ہی۔ بہر حال اتنا تو اس سے ضرور ثابت ہوتا ہی کہ روایات و عقائد خواہ صحیح ہوں یا غلط کتنی زیادہ مدت تک چلتے ہیں۔ یا آپ ٹوٹمی تہذیب کے چھوٹی چھوٹی ٹکڑیوں میں تقسیم ہونے، فرضی رشتے قائم کرنے اور نظام بنانے کے رُجحان کو لیجیے اور اس کا مقابلہ اس صورتِ حال سے کیجیے جو ہندستان کے قریب قریب کل فرقوں میں نظر آتی ہی۔ اس میں شک نہیں کہ قبیلے کے باہر شادی، جو ٹوٹمی تہذیب کی خصوصیت ہی، ترک کر دی گئی ہی اور اس کی جگہ گلّہ بانوں کے دستور کے مطابق ذات یا گوتھ کے اندر شادی ہونے لگی ہی لیکن نظام بنانے اور تقسیم در تقسیم کا ضرورت سے زیادہ شوق اب تک باقی ہی۔ ہمیں اس سے انکار نہیں کہ اس کا ایک مفید پہلو بھی ہی۔ اگر یہ نظام بنانے کا مادہ ٹوٹمی تہذیب کے اثر سے قدیم اہلِ ہند میں نہ ہوتا تو وہ فلسفے اور ریاضی میں اتنا کام نہ کرتے۔ ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ اہلِ ہند نے صفر کا تصور قائم کر کے نہ صرف ریاضی بلکہ کل حکمتِ نظری میں بہت بڑا اضافہ کیا۔ اسی "صفر" کی بدولت کسور اعشاریہ وجود میں آئیں اور اسی کی بدولت بڑی بڑی مقداروں کا حساب کرنا ممکن ہو گیا۔ ہند کا صفر

کا تصوّر مغرب تک پہنچا۔ اسی سے وہ نظری بنیاد قائم ہوئی جس پر اہلِ عرب نے ہیئت اور طبعیات کی شاندار عمارتیں کھڑی کیں اور جس کے آگے چل کر یورپ میں سائنس کی نشو و نما کو مدد ملی۔ دوسری طرف یہ تصوّر مشرق کی طرف وسطی امریکا تک پھیل گیا۔ بعض لوگوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے کہ ہندستان کی اس ایجاد کی تہ میں کچھ تو ٹوٹمی تہذیب کا تنظیم و تجرید کا رجحان، اور کچھ مادری تہذیب کا چاند کے اوتار کا تصوّر تھا یعنی اس نجات دہندہ کا جس نے بودھ کی شکل میں جنم لیا اور ایک ایسے مذہب کی تلقین کی جس میں نہ خدا کا اقرار ہے نہ انکار بلکہ "لا" کا ایک مثبت تصوّر کیا جاتا ہے یہ سمجھ کر کہ اگر ہم ہر معلوم شے کے وجود کو رد کر دیں تو نامعلوم حقیقت تک پہنچ جائیں گے پھر ان دونوں چیزوں کے علاوہ بہت بڑے اعداد اور مقداروں کا شوق بھی ہے جو ہم نے خانہ بدوش گلہ بانوں کی تہذیب میں پایا تھا بلکہ آریوں کے اس اثر سے قدیم اہلِ ہند کو یہ نقصان پہنچا کہ تاریخ اور دیو مالا میں تعداد اور مقدار کے معاملے بہت زیادہ مبالغے سے کام لیا جانے لگا۔

گلہ بانوں کی تہذیب سے ہندستانی تہذیب نے جو کچھ لیا اس میں اس سے کہیں زیادہ اہم چیزیں بھی تھیں۔ اس کے بار بار کے حملوں نے ہندستان کی ساری معاشرت اور ایک حد تک مادی اور مذہبی زندگی کو بھی بدل دیا۔ کیا اس میں کوئی شبہہ ہو سکتا ہے کہ عورتوں کو پردے میں رکھنے اور انھیں مردوں کی املاک سمجھنے کا طریقہ کہاں سے لیا گیا؟ بہ ظاہر یہ تصورات منو کے دھرم شاستر اور قرآن مجید سے ماخوذ ہیں۔ لیکن یہ تاویلیں قرون وسطیٰ کی آخری صدیوں میں کی

گئیں۔ یہ رواج نہ تو ہندستان کی آریائی تہذیب میں موجود تھے نہ ابتدائی آریا حملہ آوروں کے زمانے میں جو ایک معتدل پدری تہذیب کے حامل تھے اور نہ انھیں قرآن مجید کی حقیقی تعلیم سے کوئی تعلق ہے۔ یہ وسطِ ایشیا کے خانہ بدوش گلّہ بانوں کے ساتھ آئے جو بار بار ہندستان پر حملہ کرتے رہے۔ ان حملہ آوروں نے دیکھا کہ اگر اپنی ذاتی یا قومی رسموں کی کوئی مذہبی یا نیم مذہبی سند پیدا کرلیں تو ان کے قائم رکھنے میں زیادہ آسانی ہوگی اور اس میں انھیں کامیابی ہوئی۔ اب وہ وقت آگیا ہے کہ علم الاقوام کی تحقیقاتی مدد سے ہم ان چیزوں کا بے لاگ علمی جائزہ لیں اور دیکھیں کہ کیا کر رہے ہیں اور کن چیزوں کو مذہب کے نام سے مگر حقیقت میں خانہ بدوش گلّہ بانوں کی تقلید میں اختیار کیے ہوئے ہیں۔

یہ بات ہندستان کے موجودہ لباس پر بھی صادق آتی ہے۔ آج کل بہت کم ملک ایسے ہوں گے جہاں انسان کی دولت، حیثیت، عزت اور "شرافت" کا اندازہ اس حد تک اس کے لباس کی مقدار اور وزن سے کیا جاتا ہو جیسے ہندستان میں کیا جاتا ہے۔ اگرچہ شاید ہی کوئی مہذب ملک اس قدر گرم خطّے میں واقع ہو اور شاید ہی کہیں گرمی کی اتنی زیادہ اور سردی کی اتنی کم اہمیت ہو جتنی ہندستان میں ہے۔ لیکن کہیں بھی لوگ اتنے بھاری سوتی اور اونی کپڑے نہیں لادتے جتنے اس ملک میں۔ ہندستانی عورت کی ساڑھی ان سب کپڑوں سے جو دوسرے ملکوں کی عورتیں گرمی میں پہنتی ہیں وزن میں دُگنی بلکہ دُگنی سے بھی زیادہ ہوتی ہے۔ کسانوں اور مزدوروں کی عورتوں نے کم سے کم اس عمدہ اور صحت بخش رسم کو قائم رکھا ہے کہ وہ کمر اور سینے کے

بیچ کے حصے کو کھلا رکھتی ہیں جس کی وجہ سے اندرونی اعضا اور پھیپھڑوں کا نچلا حصہ ٹھنڈا رہتا ہے۔ اُن کی صحت اور جسمانی حالت نمایاں طور پر متوسط طبقے کی عورتوں کے مقابلے میں بہتر ہے حالانکہ انھیں کھانے کو کم ملتا ہے۔ ان کے رہنے سہنے اور نہانے کا انتظام مقابلتہً خراب ہے۔ یہ ایک حد تک اس کی برکت ہے کہ انھوں نے ہندستان کی قدیم سادہ وضع کو جو اس آب و ہوا کے لیے زیادہ موزوں ہے قائم رکھا ہے۔ متوسط اور اونچے طبقوں کی عورتوں کو فیشن اس پر مجبور کرتا ہے کہ تہ بہ تہ ساڑھی کے علاوہ بنیان، بلاؤز اور فراک بھی پہنیں۔ یورپی عورتوں نے جنھیں ساڑھی کی خوبصورتی اور نفاست بہت پسند آئی مجھ سے یہ کہا کہ وہ گرمی میں ساڑھی کبھی نہ باندھتیں اس لیے کہ دُہرا لباس پہن کر گھُٹنا، جو آج ہندستانی عورت کی عزّت اور شرافت کا معیار ہوگیا ہے، ان کے بس کی بات نہیں۔ پھر بھی عورتوں کا یہ مخلوط یورپی اور ہندستانی لباس ان کپڑوں کے مقابلے میں ہلکا اور قابلِ برداشت ہے جسے لاد کر ہندستان کے مرد دفتر جاتے ہیں یا صحبتوں میں شریک ہوتے ہیں۔ عورتوں کو کم سے کم بازو کھلے رکھنے کی اجازت ہے مگر مردوں کے بازو صرف اسی وقت کھلے رہ سکتے ہیں جب وہ شرٹ اور شارٹس پہنے ہوں۔ لیکن یہ خوشنما اور آرام دہ لباس دفتروں اور صحبتوں میں قبول نہیں کیا جاتا۔ یورپی لباس جاکٹ، لمبی آستینوں کی قمیص اور مفلر جس قدر تکلیف دہ ہے وہ ظاہر ہے۔ لیکن کیا ٹرکش کوٹ یا شیروانی اس سے کچھ بہتر ہے؟ یہ مانا کہ اس کے ساتھ نکٹائی کا جھگڑا نہیں لیکن اس کی لمبائی اور کالر کی اونچائی کی وجہ سے اور بھی زیادہ دَم گھُٹتا!

ہی۔ ٹرکش کوٹ جیسا اس کے نام سے ظاہر ہوتا ہی، نقل ہی اُس لباس کی جو وسطِ ایشیا کے برفانی میدانوں میں پہنا جاتا ہی جہاں جسم کو برف اور پالے سے محفوظ رکھنے کا مسئلہ نہایت اہم ہی۔ اس کا استعمال استوائی خطّے میں اسی قدر تکلیف دہ، مضرِ صحت اور خلاف عقل ہی جتنا اونی موزوں اور چمڑے کے بھاری جوتوں کا جو یورپ کی سرد آب و ہوا کے لیے موزوں ہیں نہ کہ ہندستان کے لیے۔ اور اگر پوچھا جائے کہ آخر یہ جھنجھٹ کس لیے تو اکثر ہندستانی یہی جواب دیں گے کہ ہمارا مذہب "شریفانہ" لباس پہننے کا حکم دیتا ہی۔ ظاہر ہی "شریفانہ" سے مراد ہی رسم اور فیشن کے مطابق اس لیے کہ علمِ تاریخ اور علم الاقوام دونوں سے یقینی طور پر اس کا ثبوت ملتا ہی کہ مسلمانوں اور ہندوؤں دونوں کے مذہب میں ایک سادہ لباس جو گرم ملکوں کے لیے موزوں تھا نہایت شریفانہ سمجھا جاتا تھا۔ قدیم اسلامی لباس حاجیوں کے جامۂ احرام کی شکل میں اب تک موجود ہی۔ اس میں دو بغیر سلی ہوئی سوتی چادریں ہوتی ہیں جن سے جسم کا اوپر کا حصہ قریب قریب کھلا رہتا ہی۔ اسی طرح مندر کے پجاریوں اور برہمنوں کے کپڑوں اور زمورن کی شاہی پوشاک کی شکل میں قدیم ہندو مذہب کے امرا اور مذہبی پیشواؤں کا لباس بھی اب تک چلا آتا ہی۔ یہ بھی ایک بغیر سلی سوتی چادر ہوتی ہی جس کو اس طرح لپیٹتے ہیں کہ اوپر کا جسم سارا کھلا رہتا ہی۔ یہی مصر، یونان، قدیم ہند اور عرب کی عظیم الشان تہذیبوں کے بانیوں کا لباس تھا اور ایک حد تک اہلِ روما کا بھی۔ اور یہی وہ لباس ہی جو ایک گرم ملک کی آب و ہوا اور حفظانِ صحت کی ضرورتوں کے لحاظ سے

موزوں ہے۔ لیکن آج ان زبردست بانیانِ تہذیب کے لباس کو خلافِ تہذیب، منافی اخلاق، بے شرمانہ اور خدا جانے کیا کیا کہا جاتا ہے۔ کیوں؟ محض رسم کی وجہ سے۔ اور یہ رسم قائم کس طرح ہوئی؟ اس طرح کہ پہلے شمالی ایشیا کے اور پھر شمالی یورپ کے فاتح ہندستان آئے۔ یہاں کے لوگوں نے ان کی نقل کی اور انھوں نے اپنے اوہام اور خیالات لباس کے بارے میں ہندستانیوں کے ذہن میں زبردستی ٹھونس دیے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز بحر منجمد شمالی کے علاقے میں مفید اور آرام دہ ہے ممکن ہے جنوب میں مضر ہو۔ شمالی ایشیا والوں کا لمبا اور ڈھیلا ڈھالا یا شمالی یورپیوں کا چُست لباس خود ان کے لیے عزّت اور شان کی علامت بن گئی ہے۔ ان میں وہ فراست اور ماحول سے مطابقت کا وہ مادّہ نہیں تھا جو یونانیوں اور آریوں میں تھا جنھوں نے مفیدِ صحت، آرام دہ اور خوشنما مقامی لباس کو اختیار کر لیا۔

یہ مختصر سی تاریخ ہے اس مسئلے کی جو معاشی اور حفظانِ صحت کے نقطۂ نظر سے ہندستان کے لیے خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ ہندستان کی قومی آمدنی کا بہت بڑا حصہ اس لباس پر ضائع ہوتا ہے جو افراد اور قوم کے لیے نہ صرف بیکار بلکہ مضرِ صحت ہے۔ ہم نے ان مثالوں میں تاریخ اور علم الاقوام سے تعلق رکھنے والے ان اسباب کی تحلیل کی ہے جن سے یہ سخت جان رسوم و روایات وجود میں آئی ہیں۔ محض شان کے لیے ضرورت سے زیادہ لباس پہننے کی مثال میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ہندستانیوں نے ان فاتحوں کے خیالات و تصورات جو شمالی ملکوں سے تعلق رکھتے تھے اختیار

کرنے میں خود انھیں بھی مات کر دیا۔ یورپی عورتیں گرمیوں میں اس سے کہیں ہلکا اور موسم کے مناسب لباس پہنتی ہیں جو ہندستان کی نیم یورپی وضع کی عورتیں پہنتی ہیں یعنی ایک تو یورپی عورتوں کا پورا لباس اور اوپر سے ساڑھی۔ یہ ہندستان کی گرمی میں اور بھی تکلیف دہ ہے۔ اسی طرح مردوں کا لباس یعنی گہرے رنگ کی شیروانی اور لمبی آستینوں کی قمیص ان کپڑوں سے کہیں زیادہ بھاری ہے جو یورپ کے مرد عموماً گرمی میں پہنتے ہیں۔ اسی قسم کا مقابلہ سوویٹ جمہوریتوں کے ترکی منگولی اور دوسرے شمالی باشندوں سے کیا جا سکتا ہے جو گرم موسم میں ہندستانیوں سے سبک تر اور موزوں تر لباس پہنتے ہیں۔ ہندستانیوں کا لباس تو وہ ہے جو ان شمالی قوموں کے آبا و اجداد کا قدیم قومی لباس تھا۔

یہ ان بے شمار مثالوں میں سے چند ہیں جو اس سلسلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ لیکن، یہ اس بات کو دکھانے کے لیے کافی ہیں کہ علم الاقوام کی تحقیقات سے کیا نظری اور عملی فوائد حاصل کیے جا سکتے ہیں۔

ان مختلف طریقوں کا مشاہدہ کرنے سے جو نوع انسانی نے تہذیب و تمدّن کی ترقی کی کوشش میں اختیار کیے اور اس کی غلطیوں پر نظر ڈالنے سے ہم رواداری کا سبق سیکھتے ہیں اور اس حقیقت سے آگاہ ہوتے ہیں کہ خود ہمارے تعصبات بھی ان "وحشیوں" سے کچھ کم نہیں جن کو ہم اس قدر حقیر سمجھا کرتے ہیں حالانکہ انھوں نے بہت سی باتوں میں خیال کی اس وضاحت اور تصوّر کی اس بلندی اور پاکیزگی کو قائم رکھا ہے جو اولین یا اصلی تہذیب کی خصوصیت تھی۔

زندگی کی پیچیدگی اور تکلفات، رسم و رواج کے "معیار کو قائم

رکھنے" کے بے جا مطالبے نہ تو اعلیٰ تہذیب کا مقصد ہیں اور نہ اس کی علامت۔ علمی استدلال، مذہب و اخلاق کے اصول اور اولین تہذیب کا اصلی تصور سب اس پر متفق ہیں کہ سادگی، وضاحت اور پاکیزگی کو نوع انسانی کا دستور العمل قرار دینا چاہیے۔ علم الاقوام کی مدد سے ان مختلف طریقوں کا مقابلہ کر کے جو انسانی تہذیب نے اختیار کیے اور ان راہوں کا جائزہ لے کر جن میں وہ بھٹکتی اور چکر کھاتی رہی، ہم اس قابل ہو جاتے ہیں کہ اپنے اوپر تنقید کر سکیں اور زندگی کے کُل مسائل کو وسعتِ نظر سے دیکھ سکیں۔ ظاہر ہے کہ اصلی یا اولین تہذیب اور ان تینوں ابتدائی تہذیبوں کا جو اس سے نکلیں یہ مختصر سا خاکہ جو یہاں پیش کیا گیا ہے صرف اس مقصد کے لیے جو ہمارے پیش نظر ہے بنیاد کا کام دے سکتا ہے۔ یہ محض ایک دیباچہ ہے اقوام ہند کی تاریخ کا اور ایک تحریکِ ذاتی تحقیق اور مطالعے کی۔

اس کے بعد دوسرا قدم یہ ہے کہ ہر برِّاعظم میں ابتدائی قوموں کی موجودہ حالت اور تاریخ پیش کی جائے اور قبل تاریخی زمانے کے خاص خاص واقعات پر بھی نظر ڈالی جائے۔ مگر یہ بھی ایک پس منظر ہوگا ہندستان کے علم الاقوام کی ایک چھوٹی سی تصویر کا جو ہمیں کھینچنی ہے۔ یہی پس منظر اگلے چند بابوں کا موضوع ہے۔

اس سلسلے میں یہ بھی ضروری ہے کہ آثارِ قدیمہ کے مسائل کا ایک بہت ہی مختصر اور محدود خاکہ دے دیا جائے۔ اس کی تو اس چھوٹی سی کتاب میں کسی طرح گنجایش نہیں کہ علم آثارِ قدیمہ کی موٹی موٹی باتیں بھی سب کی سب لکھی جا سکیں۔ پھر بھی بغیر اس کے بنیادی عناصر کا

ذکر کیے ہوئے ہم مختلف برّاعظموں کی اور پھر خود ہندستان کی ابتدائی اقوام کا نقشہ کھینچ ہی نہیں سکتے۔

حقیقت میں اس کے لیے بھی ایک اتنی ہی بڑی کتاب کی ضرورت ہی جتنی یہ کتاب ہی۔ جگہ کی کمی کی وجہ سے ہم تو اتنا بھی نہیں کرسکتے کہ تین چار بابوں میں اس توازی کا ذکر کردیں جو علم الاقوام کے تہذیبی دائروں اور قبل تاریخی تہذیب کی ان چار بڑی قسموں میں پائی جاتی ہی جن کا آثارِ قدیمہ کی تحقیقات نے پتہ لگایا ہی۔ پس صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ علم الاقوام کے تہذیبی دائروں اور آثارِ قدیمہ کے پتھر کے اوزاروں کی خاص خاص قسموں میں تعلق پایا جاتا ہی۔ تفصیلات کو چھوڑکر ہم اس تعلق کا ذکر اگلے باب کے شروع میں کریں گے اور برّاعظموں کا اقوامی نقشہ پیش کرتے ہوئے اس تعلق کی طرف اشارہ کرتے جائیں گے۔ ظاہر ہی کہ یہ ذکر نہایت مختصر اور سرسری ہوگا ورنہ پھر خود علم الاقوام کے مسائل کے لیے جگہ نہیں رہے گی۔

DATE LABEL